رِئے جی کے ہم جو رُسوا
شب انصاری
نور پبلیکیشنز
سروے نمبر ۱۴۱/ بی، جونا آگرہ روڈ، مدینہ آباد، مالیگاؤں 9226120871

ناشر

نور پبلیکیشنز

41/B، مدینہ آباد، جونا آگرہ روڈ، مالیگاؤں

باسمہ تعالیٰ

کتاب کا نام : ہوئے جی کے ہم جورسوا

مؤلف : شبؔ انصاری

ناشر : نور پبلیکیشنز، مدنیہ آباد، جونا آگرہ روڈ، مالیگاؤں

پہلا ایڈیشن : جنوری ۲۰۱۲ء

تعداد اشاعت : 1000

قیمت : 45 /-

کمپوزنگ وسیٹنگ : الہدیٰ کمپیوٹر کلاس، اسلامپورہ

طباعت : الہدیٰ آفیسٹ پریس، اسلامپورہ۔
Mob.09823447917
09823437917

ٹائٹل ڈیزائننگ : رشید آرٹیسٹ

ملنے کے پتے

(۱) الہدیٰ پبلیکیشنز، ۸۷، نشاط روڈ، اسلامپورہ، مالیگاؤں

(۲) سٹی بکڈ پو، قصاب باڑہ مسجد، محمد علی روڈ، مالیگاؤں

(۳) نیوسویرا بکڈ پو، محمد علی روڈ، نیاپورہ، مالیگاؤں

پیش لفظ

شب انصاری

آپ نے اکثر میلوں کی سیر کے دوران ایک دوکان "شیشہ گھر" ضرور دیکھی ہوگی۔ جہاں مقعر اور محدب آئینوں کے امتزاج سے ایسے آئینے نصب ہوتے ہیں جن میں ناظرین کو اپنا عکس دبلا پتلا، موٹا، ٹیڑھا میڑھا، بدہیئت اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ جن سے چہروں پر تبسم یا کھلکھلاہٹ پھوٹ پڑتی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی قارئین کی تفریح طبع کی ایسی ہی ادنیٰ کوشش ہے جس میں انسان کی فطری جبلت، عادات و اطوار اور رجحانات کے مختلف پہلوؤں کی پر مزاح عکاسی کی گئی ہے۔ بیانیہ میں جا بجا طنز کے نشتر بھی احساس پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔ مشمولات میں طنز و مزاح کے مضامین کے ساتھ انشائیے بھی ہیں۔

آج کے پر فتن دور کی گہما گہمی نے ایک مقابلہ جاتی اژدہام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ انسان مشینی دور سے زیادہ ہمہ اقسام کی کشمکش کے سبب ذہنی طور پر نفسیاتی دباؤ کے حصار میں ہے۔ انسان کے چہرے سے خوشی چھین لی گئی ہے پھر بھی شاعر نے رہنمائی کر دی کہ

کیا ہوا اگر خوشی نہیں بس میں
مسکرانا تو اختیار میں ہے

زیر نظر کتاب قاری کو کچھ دیر آزاد ہوا میں سانسیں لے کر شگفتہ پر مزاح اور لطیف تحریروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔ جوش ملیح آبادی نے اس رباعی میں مسکرانے کے عمل کو مقصد حیات سے تعبیر کیا ہے۔

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
صرف ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا چمن میں ہنس کر بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

فنی اعتبار سے طنز و مزاح کے مضامین میں مرکزی کردار یا تو مصنف خود ہوتا ہے یا اہل خانہ یا کوئی شناسہ علاوہ ازیں ایک فرضی واقعیت کے تانے بانے سے شگفتہ تحریریں بنی جاتی ہیں۔ میں نے واقعیت کے زینے کو پھلانگ کر تجربات و مشاہدات کی رسی پر معلق رہ کر اگلے منزلے پر جست لگانے کی سعی کی ہے۔ میری مساعی و تجزیہ کس قدر کامیاب یا

ناکام رہا ہے اس کا فیصلہ میں قارئین، مبصرین، ناقدین اور اہل فن کے سپرد کرتا ہوں۔ امید کہ اپنی آراء سے مستفید فرما کر رہنمائی کریں گے۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین، کتابت وطباعت، نشرواشاعت اور پیشکش کے سلسلے میں سب سے پہلے میں اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ عزوجل میں سجدہ ریز ہوں اس کے بعد استادِ محترم کا احسان مند ہوں جنہوں نے میرے لڑکھڑاتے قلم کی رہنمائی فرمائی۔ میں تہہ دل سے شکرگذار ہوں صدور اراکین ادارہ نثری ادب، انجمن محبان ادب، انجمن ناموس ادب اور انجمن ترقی پسند مصنفین مالیگاؤں کا جنہوں نے مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں جملہ سامعین، مبصرین اور ناقدین کا بھی شکرگذار ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے مجھے بال و پر عطا کیے۔ مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں ماہنامہ بیباک مالیگاؤں، ترجمان اردو مالیگاؤں، ہفت روزہ محاذ مالیگاؤں، ہفت روزہ بیباک مالیگاؤں دو ماہی فنون اورنگ آباد، سہ ماہی بین الاقوامی صدا سرینگر، سہ ماہی طنز و مزاح بنگلور، سہ ماہی عالمی کارواں سرینگر کا احسان مند ہوں۔ میں ذاتی طور پر اپنے احباب ڈاکٹر پروفیسر یوسف خاں صابر صاحب، ابن آدم اور ممتاز ادیب بختیار سعید آصف صاحب کا ممنون ہوں۔

اخیر میں کمپیوٹر ٹائپنگ کے لئے عمران صاحب (فردوس کمپیوٹرس) اور سرورق کی کتابت کے لئے عبدالرشید آرٹسٹ صاحب کا شکرگذار ہوں اور جناب خیال انصاری صاحب اور محمد یوسف انصاری صاحب (مدیر ترجمان اردو) و مالک نور پبلیکیشنز کا ممنون ہوں جن کی مساعی جمیلہ کے طفیل یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

برگِ گل

ادب انسانی معاشرے کا آئینہ دار ہے۔اُردو زبان کی اصنافِ سخن میں داستانوں اور مثنویوں کے قصوں میں قدیم ہندوستانی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔جہاں روایتی غزل ہمارے اسلاف کے اعلیٰ و آفاقی افکار کی غماز ہے وہیں نظم کے عہد بعہد عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے انقلاب برپا کردینے کی صلاحیت بھی آشکارا ہے۔داستانوں کے بعد ناولوں، افسانوں اور جدید غزل نے انسانی تہذیب اور معاشرے کے ارتقائی تصویر پیش کی ہے۔الغرض ان تمام اصناف کی روح، روحِ انسانی اور انسانی معاشرے سے استوار رشتہ رکھتی ہے اور ان تمام اصناف میں انسانی طرزِ معاشرت کی تنزل پزیری کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار اور شدید احساسات کی تاریخ بھی رقم ہے۔

طنز و مزاح کو بعض افراد نجانے کیوں محض حظ، مسرت اور تفریح مہیا کرنے کا سامان ہی تصور کرتے ہیں۔جبکہ طنز و مزاح میں بھی ہماری تہذیب اور معاشرے کی واضح عکاسی نظر آتی ہے۔اگر چہ مزاح، بہترین تفریح فراہم کرتا ہے مگر اس میں پوشیدہ لطیف طنز ہمہ اقسام کی معاشرتی برائیوں اور ظالمانہ نظامِ امارت کے لیے شمشیر وسناں کا کام بھی کرتا ہے۔طنز و مزاح کے اوراق میں مجھے اپنا ماحول سانسیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان میں موجود سادہ لوحی، مقابلہ آرائی، حسد، عیاری اور شرمندگی جیسے احساسات کا مرکزی خیال رکھنے والے واقعات ذہن کو حقیقی کرداروں اور حقیقی ماحول سے روشناس کراتے ہیں۔اسی لیے میری نظر میں طنز و مزاح انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

طنز و مزاح نگاری، برگِ گل سے ہیرے کا جگر کاٹنے کا نام ہے۔زیرِ مطالعہ مضامین بھی انہیں حقائق کے بیان سے مزین ہیں جو سبک رفتار زندگی سے مستعار لیے گئے ہیں۔اِن میں حقائق کی تلخی، تلخیٔ مئے جیسی ہے۔اس مئے کا نشہ بصورتِ مزاح سر چڑھ کر بولتا ہے اس کے جھنکتے ہوئے الفاظ محبوب کی پازیب سے ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں، جو نہ صرف ایک تبسم کے لئے، بلکہ مشاہدے اور محاسبے کے لئے بھی آمادہ کرتے ہیں۔

مخلص

ابن آدم

مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

ہم نے قدیم حکایات میں عمر عیار کی زنبیل، جام جمشید، الہ دین کا چراغ اور ہر قوت پر یکساں قادر جن، ساحروں کے طلسمی گولے اور اڑن کھٹولے جیسی خیالی و تصوراتی داستانیں تو خوب پڑھیں تھیں مگر اس کی نظیر ایک طلسمی آلے کی ایجاد کی شکل میں ظاہر ہوگی اس کا تو ہمارے فرشتوں کو بھی گمان نہ تھا۔ یہ طلسمی آلہ موبائل چشم زدن میں اقصائے عالم میں ظہور پذیر حالات و واقعات کو تحریر، کلام، آواز کے ساتھ متحرک و ساکت تصاویر کی شکل میں نشر کرنے کا مجاز ہے۔ موبائل فون بیک وقت کبوتروں، نامہ بروں، ہرکاروں، خطوط، کوریئر، ٹیلی گراف، ٹیلی گرام، فیکس اور ٹیلی فون جیسے ذرائع ابلاغ کا واحد متبادل ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی کشش، ضرورت اور ہنگامہ خیزیوں نے ہر خاص و عام کو اپنے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ عابدوں، زاہدوں کو توبہ شکنی پر مجبور کر رکھا ہے حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ماضی بعید میں کسی کو گمان بھی نہ گذرا تھا کہ دور دراز ممالک کے فاصلے یوں سمٹ جائیں گے۔ بحری و بری رکاوٹیں اس کی سحر آفریں لہروں سے ختم ہو جائیں گی اور ہم اپنے پیغامات دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک اس قدر آسانی سے پہنچا سکیں گے۔

عزیزانِ من! ہمارا مقصد نہ موبائل کی قصیدہ خوانی ہے، نہ تجارت، صنعت و حرفت میں اس کی اہمیت و افادیت پر بحث کرنا، نہ ہی اس کی سرعت عمل سے سروکار ہے، نہ اس کے جملہ اوصاف سے انکار۔ اس عاجز نے موبائل فون کے ادنیٰ سے مخفی استعمال پر اپنی معمولی رائے کا اظہار کیا ہے۔ موبائل نے عاشق و معشوق کے مابین حائل تمام واسطوں کو ختم کر کے بالواسطہ تعلق استوار کر دیا ہے۔

کیوں عاشق و معشوق میں حائل رہیں پردے
بس فون پہ معشوق کے نمبر کو لگادو

موبائل فون پر جہاں ساری دنیا سچ جھوٹ قول سے استفادہ کرتی ہے وہاں اگر عشاق نے بھی اس سے فیض اٹھایا تو آخر کیا گناہ کیا؟ عہد قدیم میں کبوتروں کو نامہ بر کی تربیت دی جاتی تھی تا کہ نامۂ عشق معشوق تک رازداری سے پہنچایا جا سکے مگر معصوم پرندے سے خطا بھی تو ممکن تھی۔ یوں بھی ہو سکتا تھا راستے میں ہی رقیب روسیاہ سیٹیاں بجا کر کبوتر کو اپنی چھت پر اتار لے اور نامۂ عشق پڑھنے کے بعد پھر روانہ کر دے تبھی تو مرزا نوشہ کہتے ہیں۔

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ بر عاشق کا نامہ لاتا ہے اکثر کھلا

مگر موبائل فون کی ایجاد نے عشق کو کبوتروں کا منت کش ہونے سے نجات دلا دی ہے۔ موبائل فون پر خفی پیغامات و گفتگو کی آمدورفت کا سلسلہ بڑی رازداری سے جاری رہتا ہے۔ جب گفتگو مقصود ہوئی، ایک مس کال کر کے ادھر کی خیریت کا احوال معلوم کرلیا۔ اگر ماحول سازگار اور رازداری کا تیقن رہا تو سلسلہ رومان جواں ہو اٹھتا ہے۔ موبائل فون سے مس کال اور سابقہ گفتگو کی تفاصل ختم بھی کی جاسکتی ہیں۔ تاکہ پارسائی کا بھرم قائم رہے۔

عہد قدیم میں عاشق بڑی محنت و جانفشانی سے محبت نامے تحریر کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی رسائی بصد رازداری معشوق تک ہو جائے، کسی طرح دل مضطرب کا حال معشوق کو جلد از جلد معلوم ہو جائے اسی تگ و دو میں مصروف رہتے تھے۔ بعض اوقات بے قراری اس قدر حاوی ہو جاتی کہ نامہ بر کے ساتھ ہی چل پڑتے تھے۔ مبادا کہ نامہ بر کی کوتاہی محبت نامے کی رعنائی خیال کو مفقود کر دے گویا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

عصر حاضر میں موبائل نے عشاق کی ان مشکلات کو یکسر آسان کر دیا ہے۔ جتنے وقفے میں چراغ سے جن برآمد ہوتا ہے حکم آقا اس کی سماعت، فہم و فراست سے عمل کے مرحلے تک گذرتا ہے اس سے قبل ہی ایک دلربا موسیقی کی دھن معشوق کو مسرت سے سرشار کر دیتی ہے کہ پیام عشق کی آمد آمد ہے۔ ادھر پیام عشق فضا میں محبت سے معمور سحر آفریں لہروں کے دوش پر محو پروازیوں کو مستعد کر دیتی ہے گویا "آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج" ادھر موبائل پر پیام عشق کے نزول کی نوید معشوق کو مستعد کر دیتی ہے۔ گوشہ عافیت کی تلاش میں نگاہ ناز مضطرب ہو جاتی ہے۔ جوں ہی محفوظ گوشہ میسر ہوتا ہے کمال بیباکی سے عشق کی حشر سامانیاں اپنی معراج کو پہنچتی ہیں۔ جہاں حال دل کے تبادلے، رومانی جذبات کا اظہار، شکایات و حکایات کے بعد از سر نو عہد و پیماں کے ساتھ ساتھ بالمشافہ ملاقات کے منصوبے بھی ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ مجوزہ مقام کی نشاندہی، بہانے، اشارے کنائے بھی بڑی صراحت سے طے کر لئے جاتے ہیں۔ موبائل کی اسی مفید صلاحیت پر غالب کا شعر منطبق ہوتا ہے۔

تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

موبائل فون نے خصوصاً پردہ نشین یا برقع پوش معشوق کو تمام ذلتوں، رسوائیوں سے محفوظ کر دیا ہے۔ محفل ہو یا تنہائی وہ اپنے عاشق سے برابر رابطے میں ہوتا ہے۔ محفل میں مخاطب کی صنف تبدیل کر کے اور تنہائی میں اسی صنف میں راستہ ہو یا دفتر، گھر ہو یا بستر ہر جگہ اب گفتگوئے عشق کا لطف اٹھایا جاتا ہے۔ پردہ نشینوں کے والدین کی تشویش اپنی بچیوں کے لئے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کی نور نظر، لخت جگر کہاں ہے کس حال میں ہے یہ جاننے کے لئے موبائل فون انہیں سونپ دیتے ہیں تاکہ ان کے حقوق میں کوئی کمی نہ واقع ہو۔ مگر یہ بات ان کی فہم و ادراک سے بالاتر ہے کہ منزل عشق

کے راستے اسی محافظ آلے سے ہو کر گذرتے ہیں اور عشق کو پروان چڑھاتے ہیں یہی ننھا سا آلہ معاون و راز دار ثابت ہوتا ہے۔اسی سے وہ اپنے والدین کو غلط خبر دے کر گمراہ کرتی ہیں۔موبائل کمپنیوں نے TRP میں اضافے کی مقابلہ آرائی میں اپنے صارفین کو بے پناہ ارزاں اور مفید سہولتیں مہیا کی ہیں تاکہ عاشق کو معشوق سے گفتگو میں کہیں رقم کے اسراف کا خیال نہ ستائے اور نصف ملاقات سے ہر وہ لذت کشید کی جائے جو ممکن ہو۔ہر چند کہ نہ اب وہ نامۂ معشوق کی لذت تحریر باقی ہے، نہ انتظار کا وہ اضطراب نہ وہ جان لیوا اندیشے، نہ وہ محبت کی شدت، نہ وہ جذبات میں حدت، نہ اقرار میں جدت۔وہ جذبے جو ملاقات کے طویل فاصلوں کی لذت فراہم کرتے تھے اب بسیار گوئی نے ہر ارزاں شئے کی طرح جذبات اور احساسات کو ارزاں کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کی تپش کو بھی ارزانی حد تک سرد کر دیا ہے۔محض ایک روپیے کے کال سے آپ کی رسائی معشوق تک ہو جاتی ہے۔اب عاشق و معشوق کہیں آہٹ پر کان لگائے بیٹھے نظر آتے ہیں؟ اب کہیں مینا و جام سے سامان ہجر بتاں کیا جاتا ہے؟ اب کہیں داغ، فراق، صحبت شب کی جلی ہوئی شمع خموش نظر آتی ہے؟ اب کوئی کہتا نظر آتا ہے ''عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب'' اب کسی عاشق کو زنداں میں بیاباں نوردی کا خیال آتا ہے؟ موبائل کی سرکش لہروں نے سب کو تہہ آب کر دیا ہے۔

زن مریدی

شادی کے لڈو کی کشش ہی لاجواب ہے۔ جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے للچائے۔ شادی کا لڈو بعض وقت گلے کی ہڈی بن جاتا ہے۔ نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔ نکاح کی مقدس تقاریب میں ایجاب و قبول کے مراحل میں نوشاہ میاں کو مہر معجل یا موجل کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر اپنی آزادی، خودسری اور آوارگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ نئی ازدواجی زندگی میں نئی نویلی دلہن جس ساعت سعید سے شریک حیات بن کر خوشیوں کا پیغام لے کر وارد ہوتی ہے اسی ساعت جلیلہ سے زن مریدی کی ریشمی ڈوریاں نوشاہ میاں کے پایہ نخجتہ میں یوں ڈالتی ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ پہلے پہل تو نوشاہ میاں دلہن کے گرد لٹو کی طرح گھومتے نظر آتے ہیں مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انہیں یہ احساس ہوتا جاتا ہے کہ دلہن انہیں انگلیوں کے اشارے یا خم ابرو کے اشاروں پر نچارہی ہے۔ یہاں تک مرحلہ فریقین کے درمیان جاری ہے تو کوئی حرج نہیں۔

بعض اوقات افراد خانہ کی رخنہ اندازی یا فریقین کی انا جہاں درمیان میں حائل ہوتی ہے جو معمول سے زیادہ عادت اور خصلت کا شاخسانہ ہوتی ہے وہیں پر خانہ جنگی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جب تو بھی رانی، میں بھی رانی، تو کون بھرے کنوئیں سے پانی؟ یہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا واحد حل ہے زن مریدی۔ اگر بیوی کو رام کرنا ہے تو اس کی جملہ کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور انا کی شکست جیسی ہزیمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی۔ دو آسان حل ہیں اگر وہ خاموش ہو تو مرد کو اس کے حسن، اعادات و اطوار کے ساتھ پکوان کی تعریف کرنا چاہئے اور اگر وہ ٹسوے بہا رہی ہو تو ہمدردی کرنا چاہئے معذرت کے ساتھ منالینا چاہئے اور مستقبل میں ایسی غلطی نہ کرنے کا عہد و پیمان کرلینا چاہئے۔ چوں کہ ٹیڑھی پسلی کا علاج زن مریدی کے منکھن سے ہی ممکن ہے تا کہ خانہ آباد رہے۔ بصورت دیگر مرد حضرات کو خانہ جنگی سے لے کر خانہ خرابی تک کا سفر درپیش ہو جاتا ہے۔

زن مریدی مرد کے خمیر کا جزو ہے یا ازدواجی مجبوری یا رشتوں کی کمزوری؟ یہ نکتہ ابھی زیر تحقیق ہے بعض ماہر نفسیات کے نزدیک بھی معمہ بنا ہوا ہے جسے سمجھنے یا سمجھانے سے وہ غریب بھی عاجز ہیں۔ جب معالج خود بیچارگی کا شکار ہو تو لاچار ہو رہتا ہے۔ ہمارے بزرگ زن مریدی کو بغض اور عناد کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں مگر یہی زن مریدی سسرال یا بیوی کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ سیدھے پن، شرافت اور انسانیت کا وصف قرار پاتی ہے۔ ہر انفرادی تجربے و مشاہدے سے قطع نظر حتمی فیصلہ یہی ہے کہ اگر گھر کو پرامن اور جنت نشان بنانا ہو تو اس کے آنگن میں زن مریدی کا پودا ضرور ہونا چاہئے جس کی آبیاری و نگہداشت کو معمول کا حصہ بنالینا چاہئے۔

عالمی پیمانے پر مردوں کو یوں بھی ہر جبر وظلم سہہ کر مسکرانے کی جمہوری عادت میسر ہے جس میں تصنع ان کی مجبوری ہے مگر ان میں تعلیم یافتہ مردوں کی بردباری نہیں اپنی انا قربان کر دینے کا فن بالآخر سکھا ہی دیتی ہے۔ لہٰذا انہیں اپنی ہی شریک حیات کے غمزے، عشوے، ادائیں و ناز برداریاں اٹھانے میں بھلا کیوں کر قباحت ہو سکتی ہے؟ مگر مرد عموماً انا کا غلام ہوتا ہے جو بیوی کو غلام بنانے کے خبط میں فریقین کے ساتھ ساتھ اہل خانہ، سسرالیوں اور ہمسایوں کو بھی اذیت رسانی سے باز نہیں رہتا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اس حرکت سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بیوی اور سسرال والے خائف ہو کر اس کی منت سماجت اور خاطر داری اور پذیرائی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیتے ہیں مگر پس پشت اسے بھی القابات لعنت وملامت نوازے جاتے ہیں۔ بہر کیف مرد کا ظرف نسبتاً بلند و اعلیٰ ہوتا ہے۔ جس میں زن مریدی کے عناصر اپنی گنجائش یوں پیدا کر لیتے ہیں جیسے کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں نو وارد مسافر اپنا مقام بنا ہی لیتے ہیں۔

زن مرید حضرات بڑی خندہ پیشانی سے لیڈیز فرسٹ کہہ کر خواتین کو اولیت دیتے ہیں۔ بھوپال کے نوابوں نے تو حد کر دی۔ ساری سلطنت کو بیگمات کے حوالے کر کے جذبہ زن مریدی کو سلامی پیش کی تھی۔ یہی نہیں، زن مریدی کی صفات بابرکات نے ہی ہمیں تاج محل جیسی بے نظیر و خوبصورت یادگار عطا کی۔ شہر حیدر آباد جو بیگم حیدر محل کے نام معنون ہے یا قدیم نام بھاگیہ نگر جو بھاگمتی (معشوقہ قلی قطب شاہ) کے نام پر رکھے گئے کملا نہرو پارک، رانی باغ، وکٹوریہ ٹرمینس جیسے تاریخی اثاثے بھی زن مریدی ہی کی دین ہیں۔ زن مریدی کے جذبے کے تحت مقتدر اعلیٰ کی شریک حیات کو خاتون اول کہلانے کا شرف حاصل ہوتا ہے گو ان کا حکومت میں راست کوئی عمل دخل یا حصہ نہیں ہوتا مگر وہ ہر سرکاری اندرونی و بیرونی دوروں میں موصوف کا ساتھ ضرور دیتی ہیں تا کہ موصوف ان کی ناز برداریاں اٹھا سکیں اور ان کا ذہنی توازن بھی نکیل مہار کی طرح تھامے رکھیں تا کہ وہ اپنے زلف گرہ گیر سے موصوف کے کردار اور ان کے منصب جلیلہ کی محافظت کر سکیں۔ اس طرح وہ سیاسی پارٹیوں کی طرح حکومت کو بیرونی اعانت فراہم کرتی ہیں تا کہ حکومت ڈھے جانے سے محفوظ رہ جائے اور اس سیاسی منصب کے طفیل سرکاری خرچ پر مزید سیر و سیاحت کا لطف آئے۔

زن مریدی جب تک گھر کی دہلیز میں ہوتی ہے خانگی نوعیت کی ہوتی ہے۔ مگر جونہی گھر کے حدود سے باہر نکلتی ہے تو نت نئے گل کھلاتی ہے۔ ہر بڑے آدمی سے اپنے مصرف کا کام نکالنے کا ایک تیر بہدف حل ہے ان کی ایسی کمزوری پر وار کرنا کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہے۔ ان کی بیگمات کو ہیروں کا نیکلس، جڑاؤ ہار، نولکھا ہار اور ڈائمنڈ سیٹ کے نادر و نایاب تحائف پیش کیے جائیں تا کہ موصوف کا نرم گوشہ جذبہ زن مریدی سے موجزن ہو کر آپ کے مطلوبہ مقصد کی طرف راغب ہو اور آپ نہال ہو جائیں۔ حال ہی میں ملک عبداللہ والیٔ سعودی عرب نے امریکی صدر بارک اوبامہ کی شریک حیات کو ڈھائی لاکھ ڈالر کی مالیت کا تحفہ عنایت کر کے اس روایت کو حیات نو بخشی۔ دیگر ممالک کے سربراہوں کو بھی اپنی صوابدید کے مطابق پیش رفت کرنی چاہیے تا کہ عالمی امن کو یقینی بنایا جا سکے۔

بیوی کی نزاکت اور حسن و ادا پر شوہر تو مہربان ہو جاتے ہیں مگر شوہروں کو علم ہونا چاہئے کہ عورت جسے سات پردوں کی اوٹ سے جنگ کروانے میں مہارت حاصل ہے وہ طنز کے نشتر سے ہیرے کا جگر کاٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور مرد ناداں کو کلام نازک (صلواتیں) سنا سنا کر بے اثر کرنے کے حربے سے بھی واقفیت رکھتی ہے۔ لہٰذا زن مریدی جہاں میاں بیوی کے مابین شکر رنجی کے مسئلے کا حل ہے وہیں مرد کو اپنی عزت و وقار کی حفاظت کا خوبصورت بہانہ بھی ہے۔ دوستوں اور اہل خانہ کی نظر میں عیب سہی، اپنی نظر میں باعث ذلت سہی مگر بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ بہت سے افراد اس تلخ حقیقت سے روگردانی کرتے ہیں یا تو وہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں یا غیر اطمینان بخش ازدواجی زندگی کی مار جھیل رہے ہوتے ہیں مگر اس سے بھی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس سے انکار پر سوا فتیں ٹوٹتی ہیں اور اقرار پر انا مجروح ہوتی ہے لہٰذا ذہین افراد خاموشی سے اسے روبہ عمل لا کر اس مقولے کے مصداق مطمئن ہوتے ہیں کہ گڑ سے مرجائے تو زہر کیوں دیں؟ لہٰذا یہ شجر ممنوعہ سے بھی خطرناک ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے ، کلیسا مرے آگے

دال کا تڑکا

اردو ادب میں دال کا عمل دخل خاصہ قدیم اور مستحکم ہے۔اردو ادب نے دال سے جو رشتہ وفا استوار کیا ہے، وہ اٹوٹ ہے۔جس کی نظیر ہمارے ہاں گھر داماد جیسی ہے۔جس کے گھر میں وارد ہونے کا تیقن تو ہوتا ہے مگر گھر سے جانے کا تعین نہیں۔اردو ادب بھی دال کا مرہون منت ہے۔چوں کہ اردو ادب میں دال کا استعمال کل دو مرتبہ آتا ہے، اردو کے رکن سوم اور ادب کے رکن دوم کی حیثیت سے چوں کہ دال حروف تہجی کا معروف رکن بھی ہے۔خیال کی پختگی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ داماد بھی دال سے شروع ہو کر دال پر ہی ختم ہوتا ہے، مگر دال کی کارفرمائی محض بطور رکن حروف تہجی ہی موقف نہیں ہوتی بلکہ اردو ادب کو دال نے متعدد محاورے بطور زیور عطا کئے ہیں۔وقتاً فوقتاً اردو ادب کے جیالوں نے بھی دال سے وہی دیرینہ رشتہ قائم کر کے میراث بحال رکھی ہے۔مثلاً مولوی اسماعیل میرٹھی کی معروف نظم ہے "اک لڑکی نے دال پکائی" شاید اس بیچاری بچی کو عصر حاضر کی لذت کام و دہن کی حشر سامانیوں کا علم نہ ہو، جہاں افراطِ زر کے باعث لذیذ پکوانوں نے دال پر عرصہ قبل اپنی سبقت درج کر لی ہے۔یا پھر وہ زمانہ ہی سادہ لوح، قناعت پسند اور خدا ترس بندوں کا تھا جن کے ہاں دال بھی غنیمت تھی، حتیٰ کہ مرزا غالب بھی دال کے سحر میں گرفتار رہے، جس کو تاحیات "آٹے دال کا بھاؤ" تو معلوم نہ ہو سکا، بس اس مدعا پر تکیہ رہا کہ "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟" کبھی کبھی یہ تشویش بھی پریشان کرتی ہے کہ "ہم نے یہ مانا دلی میں رہیں گے تو کھاویں گے گیا" البتہ بہادر شاہ ظفر کے ہاں سے آئی دال پر تکیہ کرنے کا افتخار انہیں بخوبی حاصل رہا۔لہٰذا قصیدہ خوانی میں بھی علمی فنکاری کا عنصر یہ ہے کہ دال کے چار مختلف مفہوم کا حق کس خوبی سے ادا کیا۔

بھیجی ہے مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف عنایت شہنشاہ پہ دال
ہے شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اس عاجز کی رائے میں دسترخوان ہو یا با محاورہ کلام، دال کے بغیر بے کیف رہتا ہے۔خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، مرد ہوں یا زن، بچے ہوں یا ضعیف، مریض ہو یا تندرست، توانا سبھوں کے نزدیک دال کی لذت، اہمیت و افادیت کی مسلمہ حقیقت یکساں ہے۔جہاں امراء کے ہاں مختلف انواع و اقسام کے مرغن کھانوں کا اہتمام ہوتا ہے وہیں دال میں مختلف قسم کے تڑکے کہیں مکھن یا ڈالڈا سے لگائے جاتے ہیں۔غرباء بیچارے دال کو ابال کر گھونٹ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔المیہ تو یہ ہے کہ ہر شخص کو گوشت، مرغ یا مچھلی کے مرغن پکوان تو مرغوب ہوتے ہیں، ان کی بہ نسبت

دال یا تو ثانوی حیثیت رکھتی ہے یا سرے سے غرباء کی علامت جان کر اسے منہ بھی نہیں لگایا جاتا ہے۔ عوام تو درکنار عابد اور زاہد حضرات بھی مرغن غذا اور لذت کام و دہن کی تلاش میں دال سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

شیخ نے دیکھی دال جہاں پر
لائے وہیں لاحول زباں پر
کھا کر بولے مرغ مسلم
صلی اللہ علیہ وسلم

مگر دال کی مختلف مصنوعات جیسے پکوڑے، دالباٹی، دہی بڑے اور پاپڑوں پر بھی رال ٹپک جاتی ہے۔ اس امر سے حضرت انسان کی طوطا چشمی بھی جگ ظاہر ہے، گویا ''گڑ کھانا اور گلگلوں سے پرہیز کرنا۔''

اوائل شباب سے اکثر عزیزوں کے انتقال پر تجہیز و تکفین و مابعد تدفین کے مرحوم کے پسماندگان تو متواتر تین روز تک طعام کا ذمہ اقارب کے سپرد کر دینے کا رواج ہے۔ اس پر سوز و پر سوگ ماحول میں عوام کی دال چاول سے مانوسیت بھی روایتی ہے۔ لوح و زبان پر حرف مکرر کے مصداق ذائقے کی یکسانیت گراں نہ گذرے، لہٰذا جا بجا کھٹائی تو کبھی تڑکے کے استعمال سے لذت تبدیل کی جاتی ہے۔ بھلا ہو افراطِ زر کا کہ اب ایسے مواقع پر دال کی جاگیر پر پلاؤ، دالچے، قورمے و دیگر مرغن پکوانوں کا قبضہ ہوا چاہتا ہے۔ چوں کہ شاعر بڑی دور رس نگاہیں رکھتے ہیں، شاید اس لئے اکبر الٰہ آبادی نے پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی۔

کوئی بتلائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

موجودہ دور میں مرحوم کے پسماندگان، عزیزان گرامی اور ہمسایوں کی تعداد میں اچانک خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہے، جو اس مغالطے کا غماز ہے کہ مرحوم ہر دلعزیز، نیک سیرت، فرشتہ صفت اور مقبولیت کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ دراصل اس اضافی تعداد کا محرک وہ پر تکلف مزہ ہے، جو تین دنوں تک سوگواروں کو ہر نت نئی لذت کام و دہن سے آشنا کرتا ہے بلکہ قابل ستائش ہجوم اکٹھا کرتا ہے۔

دال کی کثرت استعمال کے سبب ہمارا دال سے رشتہ خاصہ بے تکلف ہو چکا ہے۔ بنی نوع انسان نے حسب عادت جا بجا شخصی قباحتوں اور حالات و واقعات کے اظہار کے لئے دال کا دامن استعارتاً پر وہ از خود طے کر لیا ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم ہم ہمہ وقت دال کی مٹی پلید کرنے کے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بات بات پر طعنہ زنی کے لئے دال کا وسیلہ درکار ہوتا ہے۔ جیسے گھر کی مرغی دال برابر، جوں ہی حضرت انسان کی نیت میں فتور آ جائے تو آنکھوں میں سور کا بال اتر آئے تو ہم دال میں کالا کہہ کر فوراً دال کو مورد الزام ٹھہرا دیتے ہیں۔ بدنظمی، افراتفری اور افراطیت کا استعارہ ہے۔ ''جوتوں میں دال بانٹنا'' یہ ساری باتیں دال پر ہی کیوں موقوف ہیں؟ وہ بھی جوتوں کے ساتھ، ہائے ذلت کیا دیگر اشیائے

خوردونوش کو ہدف نہیں بنایا جا سکتا تھا؟ جب کوئی ادنیٰ شخص اعلیٰ عزائم کے لئے حوصلہ مجتمع کرے تو "یہ منہ مسور کی دال" کہہ کر مسور کی دال کو بھی اس کے ساتھ ذلیل کر دیتے ہیں۔ "دال روٹی میں مست ہونا" اس عالم رنگ و بو میں بے شمار مظاہرے وجلوؤں سے مست ہوا جا سکتا ہے۔ دال اور روٹی کا استعمال محض مفلسی کی غمازی کرتا ہے۔ صحت کی خرابی کے دو واضح اسباب ہیں یا تو موسم کا اثر یا پھر ہماری اپنی بے اعتدالی مگر دال پتلی ہونا، کہہ کے دال اپنی لطیف ترین ہیئت میں موجب گناہ قرار پاتی ہے۔ جس کی دارساتی تو یوں ہے کہ علالت کے دوران سارے مرغن پکوان درکنار رہ جاتے ہیں، مریضوں کی دگرگوں حالت کو دال ہی غذائیت فراہم کرتی ہے۔ "دال نہ گلنا" جب کسی شخص کی متوقع پذیرائی نہ ہو یا صحبت ناہم جنس سے پالا پڑ جائے تو دال نہ گلنے کا شکوہ زبان زد خاص وعام رہتا ہے۔ یوں بھی دال کے بے شمار احسانات بنی نوع انسان پر ہیں۔ نومولود بچوں کو دال کا پانی پلایا جاتا ہے۔ ضعیف العمر حضرات اور مریضوں کو دال کی زود ہضمی راس آتی ہے، چاند میں داغوں کی تعبیر کہ دال سے اکثر گیس کی شکایت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ "جبل گروک جبلت ناگروک" کے مصداق بنی نوع انسان اقتدار کی بقاء کے لئے اپنے ہی معاشرے پر ظلم ڈھاتا ہے۔ جسے عموماً سینے پر مونگ دلنا سے تعبیر کیا جاتا ہے، کسی کو تنگ کرنے کی ایسی ظالمانہ نظیر شاید ہی کہیں اور میسر ہو۔ بہر حال ظالم تو بیرنگ چھوٹ جاتا ہے، مگر ساری بلا مونگ کے سر آجاتی ہے۔ ایک ضرب المثل ہے "ناکوں چنے چبانا" اولاً یہ عمل سرے سے غیر فطری اور ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ناک کے خواص حسن وجاہت، قوت شامہ اور عمل تنفس کی سبیل ہیں۔ لہٰذا اس سے چنے چبانے کا عمل خاصہ ثقیل ہے۔ کسی کو مشکل ترین مرحلے سے گذارنے کو اس بے رحمی سے چنے چبانے کی تشبیہہ دی جاتی ہے کہ دالوں کی انجمن ہی تلملا اٹھے۔

خانساماؤں نے اپنی شہرت اور ہوٹل کے مالکان نے ارتکاز دولت کے لئے دال کی نت نئی مصنوعات پیش کی ہیں۔ مثلاً دال شاہی، دال مکھانی، دال شاہجہانی وغیرہ وغیرہ، مگر اس عمل کی تحریک دال کی خدمات کے اعتراف کے اظہار کی سبیل نہیں۔ یہ تو مال وزر کی حرص وطمع کی تحریک کا باعث ہے۔ دال کے اس قدر استحصال اور بے جا برتاؤ سے دال کی انا کو ٹھیس پہنچی، جذبات مجروح ہوئے تو دال نے انتقاماً علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ دال نے انسان کو مفلسی اور ناگفتہ بہ صحت پر رحم وکرم کیا، مگر ہم بنیادی طور پر ناشکرے ہیں اور جا بجا احسانات تو درکنار، ہم اس کی ارزانی کے گلے شکوے ہی کرتے نظر آتے تھے۔ اپنی جملہ قباحتوں کو دال کے پاک دامن پردے میں پوشیدہ رکھنے، نیز نام بنام بدنام کرنے سے دال بھی تنگ آکر اپنی ذات پر اتر آئی ہے لہٰذا دال نے نہ صرف انتقام بلکہ اپنی اہمیت درج کروانے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا ہے۔

کل سودا سلف لینے کی غرض سے فضلو چچا کی دکان پر پہنچا تو چچا نے بتایا۔ "میاں! تور کی دال کے دام 100 روپیے فی کلو ہو گئے ہیں۔" میرے ذہن میں فوراً تقابلی مطالعہ شروع کر دیا کہ مچھلی گائے کا گوشت اور بائلر مرغ تو 80 روپیے کلو میں مگر روٹھی ہوئی دال نے ان تمام اشیائے خوردنی پر سبقت لے کر 100 روپیے فی کلو کا تمغہ جیتا ہے۔ آخرش استحصال اور قوت برداشت کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ اب تک ہم دال کو تڑکا لگاتے رہے مگر اب دال ہمیں تڑکا لگا رہی ہے۔

قربانی کا بکرا

جمعرات کی شب تادیر محفل یاراں میں گذاری۔ لذت خواب سحر میں غرق تھا کہ محترمہ بیگم صاحبہ کی کرخت آواز کانوں میں پڑی کہ نیند کا طلسم ٹوٹ گیا۔ خیرن کے یہاں بیل اور نسرین کے ہاں دو صحت مند بکرے آچکے ہیں عید قرباں سر پہ ہے۔ سب ہمسائے مجھ سے پوچھ رہے ہیں تمہارے ہاں قربانی کس کی ہوگی؟ جی میں آیا کہہ دوں "میری"، بیگم پھر جھنجھلا کر کہنے لگیں نہ جانے کہاں کہاں کی ذلتیں اٹھانی پڑیں گی، بچوں نے بھی مجھے پریشان کر رکھا ہے، کہ امی ہمارا بکرا کب آئے گا، آپ تو شب و روز سر جھکائے جانے کیا فضولیات لکھتے رہتے ہیں بھلا دنیا جہان کی فکر بھی ہے آپ کو۔ اس لمبی چوڑی تقریر نے حواس باختہ کر دیا۔ بیگم شامت بن کر سر پر کھڑی تھیں۔ لہٰذا فوراً سے پیشتر بستر چھوڑا جنگی پیمانے پر برش اور نہانے سے فارغ ہوا۔ بیگم کو کچن میں نہ پا کر چائے تھرماس سے انڈیل کر پی۔ ناشتے کے دوران مزید کامنٹری سننے کی تاب نہ تھی اس لئے سفید کرتا پاجامہ زیب تن کر کے گھر سے روانہ ہوا تھا کہ بچوں نے گھیر لیا کہ ہم بھی بکرا لانے ساتھ چلیں گے۔ میں نے دونوں کو ساتھ بطور ڈھال لیا اور منزل کی طرف چل پڑا۔ مویشیوں کی منڈی کو کاٹن مارکیٹ یا نیلام گھر سے بھی تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں بکروں اور بکرا فروشوں کا ہجوم بیکراں تھا۔ مجھے بکروں کی فربہی راس نہ آئی، نہ وزن نہ خوبصورتی نہ جاذبیت۔ ان کی قحط زدگی نقاہت اور لاغر پن صومالیہ کے باشندوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ میں نے جس اعلیٰ ذوق کے نمونے کی تلاش کا قصد کیا تھا وہاں کوئی بھی میرے معیار انتخاب کو نہ پہنچ سکا تھا۔ سوئے اتفاق فاروق سے ملاقات ہوگئی جو میرا پرانا پڑوسی اور قصاب تھا۔ میں نے جب فاروق سے بکروں کی خرابی صحت کا راز جاننے کی کوشش کی تو اس نے بے اعتنائی سے کہا یہ جنگلی بکرے ہیں دیہات سے لائے گئے ہیں۔

فاروق نے مجھے پرانی بکرا منڈی مدعو کیا کہ ایسے جاندار خوبصورت جاذب نظر بکرے آئے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ فاروق مجھے یوں راغب کر رہا تھا گویا سارے بکرے صرف میری خاطر مدارت کے لئے لائے گئے ہوں۔ فاروق سے شام ساڑھے چار بجے پرانی بکرا منڈی میں ملاقات طے پائی۔ میرے پاس ابھی وقت تھا مگر منڈی سے ناکام لوٹنے کا یارا مجھ میں نہ تھا لہٰذا بغرض نماز جمعہ مسجد کا رخ کیا۔ قربانی پر سیر حاصل خطبہ سن کر اب قربانی کا اشتیاق کروٹ لینے لگا، نماز جمعہ سے فارغ ہوا تو چار و ناچار خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ بیگم کا غصہ اب ہیجان کی حدود میں داخل ہونے کو تھا۔ سنگین حالات میں اہم موضوعات پر تساہل اور تجاہل عارفانہ برتنے سے بلڈ پریشر کنٹرول میں رہتا ہے۔ میں سیدھا دسترخوان کا رخ کیا تو بیگم نے دسترخوان سے ہانڈی اٹھالی جب تک بکرا نہ آئے گا آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔ ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے بھوک کی شدت بھی زیادہ تھی، کچھ میں نے سمجھایا اور کچھ میرے معصوم بچوں کی گواہی نے بیگم کو نرم کر دیا۔ بصد ناراضگی سے سہی مگر ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے جوں ہی قیلولے کی غرض سے لیٹنے کی کوشش کی تو بیگم پھر سوار ہوگئیں۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ صبح کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا میں نے اٹھ کر چلنے میں ہی

عافیت سمجھی۔ جاتے جاتے ہمت کر کے صرف اتنا کہہ سکا تم تو بچوں سے زیادہ ضد کر رہی ہو تو وہ چراغ پا ہو گئیں۔ مجھے چار لوگوں کو منہ دکھانا پڑتا ہے، میں نے بڑے پیار سے سمجھایا اور یقین دلایا کہ آج ہر حال میں بکری لے آؤں گا تب تنک کر بولیں بکری کیوں، میرے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ انہوں نے کہا یہاں بھی تانیث کو ترجیح۔ مردوں کی ذات ہی ہرجائی ہے، میں نے سفید کرتے پر عطر پاشی کی تو بیگم نے فقرہ کسا، نوشہ بن کر نئی دلہن لانے چلے ہیں۔ دو گواہ اور مہر کی رقم بھی ساتھ لیتے جائیں۔ میں مسکرا کر چپ رہ گیا۔ میں وقت سے پہلے بکرا منڈی پہنچ گیا تھا جس کی وجہ سے ذمہ داری سے زیادہ بیگم سے فرار حاصل کرنا تھی۔ پرانی بکرا منڈی میں بکروں کا ہجوم تھا، بکروں کی فربہی، جسامت، خوبصورتی اور جاذبیت قابل تحسین تھی۔ چار بکرے جو فربہ دراز قامت تھے پلنگ پر آراستہ گدوں پر جلوہ افروز تھے۔ ان کی وجاہت، شباہت اور صحت بھی دیگر بکروں کی بہ نسبت قابل توجہ تھی۔ ان کے آگے شیشے کی طشتری میں تقریباً ڈیڑھ کلو بادام رکھے ہوئے تھے جسے وہ شانِ بے نیازی سے کھا رہے تھے۔ میں نے حسرت بھری نگاہ ڈالی کہ ساری زندگی میں درہم و دینار ڈالر کمانے کے بعد بھی ایسی پر تعیش حیات تو مجھے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ان بکروں کے معیار زندگی پر رشک آ رہا تھا۔ تب ایک قصاب نے آہستہ سے سرگوشی کی، صاب یہ بکرا افاضل چائے کی پتی کھا کر فربہ ہوا ہے، یہ بادام تو نمائشی ہیں۔ تب میں حیران رہ گیا۔ میرا رشک بھی جاتا رہا، مگر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں بھی پیشہ وارانہ رقابت کارفرما ہے۔ اگر کاروباری چشمک کے سبب یہ راز عیاں نہ ہوتا تو شاید میں تاحیات اس بکرے کو فوق البشر سمجھنے کی غلطی کرتا اور احساس کمتری میں مبتلا رہتا۔ ایک نکتہ یہ بھی ذہن میں سوال بن کر اٹھا کہ بادام کی خوراک کا تعلق براہِ راست یادداشت یا ذہانت سے ہے۔ بکروں کے دماغ ان باداموں سے بھلا کیا نشاستہ حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ تو بکروں کو انجینئرنگ کرنی ہے نہ میڈیکل سائنس کے تمغے حاصل کرنے ہیں نہ وکالت کی جرح مقصود ہے اور نہ ہی خلا میں متحرک سیاروں سے اِن کا علاقہ ہے، درحقیقت بادام کی خوراک اِن بکروں کے مالکوں کو درکار ہے، جنہوں نے انتہائے محبت میں شریف النسل بکروں کو بگڑا ہوا نواب بننے کی ترغیب دی ہے۔ چند مرکھنے بکروں کے سوا سارے بکروں کو آپ شریف النفس کے زمرے میں شمار کر سکتے ہیں۔ چند مرکھنی بکریوں سے محترمہ بیگم صاحبہ کی تشبیہ بھی ناجائز نہ ہوگی، اگر بکروں کے مالکان اتنی محنت اور نگہداشت اپنے کسی بچے کی تعلیم و تربیت پر صرف کرتے یقیناً مستقبل میں نسل نو کا نقشہ بدلنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک دراز قامت صحت مند بکرا سب سے الگ تھلگ کونے میں کھڑا تھا۔ ماشاء اللہ باریش بھی تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکر و تدبر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میرا چھوٹا بیٹا بہت شریر ہے، اس نے بکرے کی کمر پر ہاتھ مارا تو بکرے نے کمر لچکا کر خود کو سنبھال لیا، مگر چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہونے دیئے۔ میری دانست میں وہ بکرا ضرور شاعر تھا جس کا یا تو ردیف باغی ہو گیا تھا یا قافیہ تنگ اور بحر پر مصرعہ اٹک رہا تھا۔ وہ بمشکل مشق شاعر غزل فکر تھا۔ مجھے اس بکرے کی شاعرانہ فطرت، تدبر، سنجیدگی و مستقل مزاجی نے قدرے متاثر کیا۔ میں نے اس کے مالک بڑے میاں سے دام دریافت کیا تو انہوں نے مجھے درخور اعتناء نہیں سمجھا اور بیڑی پینے میں مگن رہے۔ میں نے پھر سوال کا اعادہ کیا تو دام بتانے کے بجائے بکرے کے حسب نسب جائے پیدائش طرز افزائش عمر و قامت کے ساتھ عادات و اطوار کا ایسا بیانیہ بایوڈاٹا پیش کیا جیسے مجھے اس بکرے کو ملازم رکھنا ہے یا

نسبتی رشتہ قائم کرنا ہے۔اس کے نیک چال چلن ایماندار یا مختی ہونے کے ساتھ عادات واطوار کا مستقبل میں کوئی خاطر خواہ فائدہ مقصود ہو میں نے تیسری مرتبہ سوال کیا تو بڑے میاں نے جواب دیا، 8000 روپیئے۔میں حیران وششدر تھا۔بڑے میاں مجھے نظروں سے تول رہے تھے جیسے ذبح کرنے سے پہلے قصاب بکرے کو دیکھتا ہے۔میں نے گرہ لگائی۔حضرت میں نے ایک کے دام پوچھے ہیں تب انہوں نے تلملا کر کہا میں نے آپ کو دو بکروں کے دام نہیں بتائے۔مجھے یوں دیکھنے لگے گویا میں قربانی کا بکرا ہوں یا بننے آیا ہوں۔میں نے پھر جسارت کی۔اگر دام کم کریں تو میں خریدنے پر غور کروں گا۔بڑے میاں جھٹ بول اٹھے بکڑو والے وکیل صاحب نے 7500 کا مانگ لیا ہے اگر میں اسے دیونار مارکیٹ لے جاؤں تو پورے 15000 دام ملیں گے۔تب میں نے تاسف سے صرف اتنا کہا تو آپ کو اسے دیونار مارکیٹ بھیجنا ہی پڑے گا۔میں سوچ میں پڑ گیا کہ ہمارے ہاں شاعروں اور ان کے ہاں بکروں کی قیمت میں اتنا زیادہ تفاوت کیوں ہے؟ ایک بہت چاک و چوبند بکری تھی جس کی رسی کافی لمبی تھی اس لئے وہ بہت اچھل کود مچا رہی تھی۔کبھی چبوترے پر چڑھ جاتی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی اوپر جاتی اور قلانچیں مارتی نیچے چلی آتی۔مجھے گمان گذرا یہ اضطراب ضرور محبوب کے انتظار کا غماز ہے۔ملنے کی شدید خواہش نے بے قرار کر رکھا ہے اور وہ قلانچیں بھر کر اپنے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔کچھ منچلے بکرے بھی دام الفت کے اسیر ہوئے جا رہے تھے مگر گلے کی رسیاں مانع ملاقات تھیں۔ہر جگہ عاشق و معشوق کو یہی افتاد لاحق ہوتی ہے۔میں نے اسی قصاب سے پوچھا تو اس نے بکری کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا یہ تو پٹھیا ہے (یعنی باکرہ ہے) تب میرا ذہن اس کی دوشیزگی کی طرف مبذول ہوا۔ہمارے ہاں تو دوشیزاؤں میں پردے کے پیچھے نرم خیالات اور گرم جذبات ہوتے ہیں لیکن بکری تو رخ زیبا کی کوشش کے تکلف سے اور اپنے دلی جذبات کے اظہار پر قید و بند سے بھی آزاد تھی، کچھ ادنیٰ قسم کے بکرے زمین پر بیٹھے جگالی میں مصروف تھے۔ایسا محسوس ہوا کسی عزیز کے چہلم میں شریک ہوں جہاں قرآن خوانی کے بعد بغرض ایصال ثواب تیار کیا ہوا کھانا کھا رہے ہوں۔چہروں سے سوگ ٹپک رہا تھا۔بستروں پر براجمان بگڑے نوابوں کی جھوٹن بھی کا ہے میسر ہو جاتی تھی۔یہاں بھی طبقاتی فرق اور نسل پرستی کے عناصر کو دیکھ کر کوفت ہوئی کہ انسان نے جانوروں میں عصبیت اور طبقاتی سطحوں اور ان کے فرق پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔چشم زدن میں ایک سیاسی پارٹی کی احتجاجی تحریک کا منظر بکرے پیش کر رہے تھے جہاں پلنگ پر ایستادہ بکرے تحریک کے لیڈروں کے مقام پر تھے۔ادنیٰ قسم کے بکرے وہ احتجاجی کارندے تھے جنہیں اکثر ہانک کر لایا جاتا ہے یا خرید کر اور مضطرب بکری نعرہ زنی کرنے والی فعال متحرک لیڈر تھی۔کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔میں نے مڑ کر دیکھا تو فاروق مرے عقب میں کھڑا تھا۔میں نے اپنی پسند اور مختص بجٹ کا ذکر کیا تو اس نے محو رقص بکری کی نہ صرف وکالت کی بلکہ اسے دلا بھی دیا۔دام تھے 4000 میرے بچے بھی خوشی خوشی اپنے نئے مہمان کی آمد پر دوڑے کارواں گھر پہنچا تو میں نے کھڑکی میں بیگم کو منتظر پایا۔وہ مسکرا کر ہمارا استقبال کر رہی تھیں۔امید جو بر آئی تھی۔میں نے چٹکی لینے کے لئے کہا۔ایک محرم سالی ہی تھی بازار میں جسے میں محترمہ کی تنہائی کا خیال کر کے لے آیا ہوں۔اسے دوپٹہ بدل بہن بنالیں تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔بیگم شرما گئیں۔

در پردہ نظر آئیں نظر۔۔۔۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

شہنشاہِ ظرافت اکبر الہ آبادی کو بے پردہ بیبیوں کے پس پردہ عقل مرداں پہ پردے نظر آئے۔ بھلا کیوں نہ ہوں؟ مردوں کی ذات کو اللہ نے قوام مقرر فرمایا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بیچارے مرد" خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں" کے پیش نظر ہر کس و ناکس ناز و ادا پر آفرین کہنے کے شوقین کم اور مجبور زیادہ ہیں۔ یوں تو پردے کا مقصد صنف نازک کے رخ زیبا کی پوشش کے علاوہ سارے جسم کا پردہ ہے تاکہ اغیار کی آوارہ نگاہیں ناوک انداز نہ ہوں۔ نسوانی جسم کے خطوط پوشیدہ رہیں تاکہ بوالہوس کو طبع آزمائی کا موقع نہ ملے۔ اس دور آگہی میں ہر شئے اختراع و ایجاد کے مراحل سے گذر رہی ہے وہاں بھلا پردہ کیوں کر پیچھے رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ برقعوں میں ہر جدید تراش خراش جابجا کشیدہ کاریاں و گلکاریاں، نقوش و نگار اتنے خوبصورت اور جاذب نظر ہیں کہ فنونِ لطیفہ سے متعلق افراد انگشت بدنداں ہو کر برقعوں کے نقوش میں کھو جاتے ہیں۔ ان کی یہ بے ساختگی ناظرین پر گراں گذرتی ہے۔ فوراً ان کے دل میں گناہ کی کونپل پھوٹ پڑتی ہے کہ موصوف پردے میں پوشیدہ مال کا نگاہِ آوارہ سے جائزہ لے رہے ہیں انہیں کیا پتہ کہ وہ ماہر فن دیکھ رہا ہے کہ۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار

مغربی معاشرے میں پردہ بیزاری اب گویا لباس بیزاری کی سبیل بن گئی ہے۔ حسن و ادا، زیب و زینت اور پرکشش نظر آنے کی خواہش اور جذبہ رقابت نے لباس کو مختصر سے مختصر بلکہ چند چیتھڑوں پر مشتمل کر دیا ہے۔ جہاں پہلے صنف نازک کو جسم کے خطوط عیاں نظر آنے پر اختلاج ہوا کرتا تھا، اب لذت نمائش کا اہم ذریعہ ہے۔ جن پر حریص حسن حضرات کی نظر بد اپنا مطلوبہ ناشتہ تلاش کر لیتی ہے۔ صنف نازک کا ایسے موقع پر تجاہل عارفانہ قابل دید ہوتا ہے یعنی سراپا صاحب حسن ہی نمائش ہو جائے تو دیکھنے والے کے بسمل ہونے پر واویلا کیوں؟ حسن کو اپنے جرم کا احساس کہاں رہتا ہے؟ اس نئے رجحان کی آبیاری مشرق میں خیر سگالی کے جذبے سے کی جارہی ہے۔ مغرب میں بے پردہ ہو کر تو مشرق میں در پردہ رہ کر۔ بعض قارئین کو ہماری نیت مشکوک اور نظریئے میں بوالہوسی کے عناصر نظر آجائیں جنہیں یوں بھی عیب جوئی

میں ملکہ حاصل ہے تو باور ہو کہ ہم بنی نوع آدم ہیں اور شجر ممنوعہ سے ہماری رغبت غیر فطری بھی نہیں ہے۔ باوا آدم کی اسی وراثت نے حیات دوام حاصل کی ہے۔

عصر حاضر میں برقعوں کی جدیدیت کے نام پر ایسے چست لباس وضع کئے گئے ہیں جیسے تھیلوں میں اناج بھرا جاتا ہے۔ نو آموز بچے جن کے کچے ذہن ابھی نسوانی جسم کے خطوط کے آثار سے نا آشنا تھے اب نت نئے فہم وادراک سے بازیاب ہو رہے ہیں اور ان حقیقتوں کا قبل از وقت انکشاف معصوم ذہنوں کو بالیدہ کرنے میں کافی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ پہلے تو برقعوں کا یکساں سیاہ رنگ موزوں تھا جس سے انفرادی شناخت مشکل تھی مگر اب نئے رنگوں کے ساتھ مذکورہ بالا گلکاریوں نے ایسے گل کھلائے کہ برقع پوش بآسانی پہچان لی جاتی ہے کہ فلاں دوسری گلی کی خاتون ہیں۔ فلاں پر چونئے کی بیوی ہے اور فلاں مرزا صاحب کی دختر نیک اختر ہے۔ فائدہ ہوا تو چھیڑ خوانی کرنے والوں کو اس طرح کہ انہیں اس چلتے پھرتے زنانہ اشتہار کی خفگی کا مطلق خوف نہیں رہا اور وہ یہ بھی بھول بیٹھے کہ پردے میں کہیں اپنے گھر کا مال نہ نکل آئے۔

چمبل گھاٹی کے ڈاکوؤں نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی خاطر ناک پر کپڑا باندھ کر لوٹ مار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا تاکہ وہ بعد میں پولس یا عوام کے ہتھے نہ چڑھ جائیں یوں تو برقع پوش خواتین بھی دلوں پر ڈاکہ ڈالتی ہیں جس کا چالان بھی نہیں ہوتا۔ درزیوں (فیشن ڈیزائنر) کو ڈاکوؤں کی ادا خوب بھائی۔ جب مردوں پر ایسے فیشن کا اطلاق محال نظر آیا تو خام ذہن بیگمات کو قائل کر کے ایسی بدعت کو رواج دے دیا ہے کہ اب بیچارے چمبل کے ڈاکوؤں کو اپنا شعار ترک کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کوئی نسوانی شباہت کا طعنہ نہ دے۔

خدائے بزرگ و برتر نے صنف نازک کو مخصوص جذبات ودیعت فرمائے ہیں جیسے خود نمائی جس سے آئینے کی صنعت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ عیوب کی تلافی اور کم عمر نظر آنے کے لئے ملمع کاری (میک اپ) کی جملہ مصنوعات کے کارخانے نہ صرف فروغ پا رہے ہیں بلکہ ان کی ہجرت مغرب تا مشرق ہو رہی ہے جسے ہم ترقی سے تعبیر بھی کر سکتے ہیں۔ مردوں کی خاطر حجاموں کے سیلون ہوتے ہیں خواتین نے بھی زیبائش کے لئے بیوٹی سیلون کھول کر بقدر ذوق تسکین حاصل کر لی ہے۔ دوسری صفت ہے حسد و رقابت۔ ہر عورت دوسری عورت پر فوقیت حاصل کرنے کی خاطر ہر مرحلے سے گذرنے کو تیار رہتی ہے۔ زیب و زینت کی مصنوعات جیسے کپڑے، گہنے اور دیگر اشیائے آرائش کے کاروباریوں کو بھی ذریعہ معاش کی سبیل اللہ نے بہم پہنچا دی ہے جہاں وہ آپا جان، باجی یا بہن جی کے بجائے میڈم کہہ کر دوگنے، سہ گنے دام بھی کما لیتے ہیں۔ الغرض اس معرکۂ ہم جنس نے ایک مقابلہ جاتی اژدہام کی صورت اختیار کر لی ہے خدا خیر کرے۔

بقول خواتین مردوں کی ذات جو ازل سے ہرجائی ہے نباض اور روباہ مزاج ہے اپنے فائدہ و منفعت کی صورت ہر جگہ تلاش کر لینے کا ماہر ہے وہ خود تو سرتاپہ ملبوس رہتا ہے رہی سہی کسر جوتوں اور عینک سے ڈھک کر پوری کر لیتا

ہے۔ صنف نازک کو اشتہارات، ماڈلنگ وٹی وی کے کاروبار کا ایسا لازمہ بنا چکا ہے کہ موسم کا حال اگر مرد بتائے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ وہی اگر صنف نازک سمجھائے تو چہرے پر تشویش عیاں ہوتی ہے نتیجتاً مرد نہ صرف روپیہ کماتا ہے بلکہ صنف نازک کا استحصال بھی کرتا ہے۔ یہاں حسن کی خود فراموشی اور بے نیازی بھی قابل ذکر ہے۔ گویا ؎

وا کر دیئے شوق نے بندِ نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

حسن کی بے نیازی بے جا بھی نہیں کچھ تو معصومیت کی غماز ہے اور کچھ مال وزر نام ونمود کی ہوس۔ ہر وہ شئے جو صنف نازک سے متعلق ہو یا نہ ہو وہاں اشتہارات میں ان کی نمائندگی ناز وادا معنی خیز اور بعض اوقات ذو معنی فقروں کی دلربا ادائیگی نمائش کا اہم ذریعہ ہے۔ ان اشیاء کے خواص پر صنف نازک کے جلوے حاوی ہوتے ہیں جو ناظرین کو اشیاء خریدنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ عہد قدیم میں صنف نازک کے لئے تاج محل اور بی بی کا مقبرہ تعمیر ہوئے۔ مستورات پردہ میں رہتیں جن کی عصمت وعفت کی خاطر مرد باہم دست وگریباں ہو جاتے تھے اور بعضے بسمل عشق بھی۔ عصر حاضر کے اشتہارات میں مسکراتی ہوئی نیم عریاں بنت حوا مرد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شیونگ بلیڈ خریدنے پر ناظرین کو آمادہ کر رہی ہے۔

ہمارے ملک میں چند مردوں کا شیوہ ہے بات بات پر شرٹ اتار کر مظاہرہ مردانگی کرنا ان کے سوا بقیہ تمام مرد تہ در تہ لباس (تھری پیس کوٹ) پہنتے ہیں۔ ادھر صنف نازک بھی چہروں پر تہ در تہ میک اپ کرتی ہے اور جسم کے مخصوص حصوں کی پوشش سے اکثر بے خبر رہتی ہے (عمداً یا سہواً) جن پر مردوں کی خصوصی نگاہِ کرم ہوتی ہے مردوں نے صنف نازک کو ناقص العقل کا خطاب عطا کیا تھا اب جا بجا ثابت بھی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے لہٰذا اب بھی صنف نازک نے ہوش کے ناخن نہیں لئے اور بدستور عقلوں پر پردہ پڑا رہا تو حالت یہ نہ ہو جائے

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہوتا ہے شب وروز

دنیا تو مملکت خداداد ہے۔ پھر بھی ہم بہت ساری مادی وغیر مادی اشیاء کی ملکیت کے مجاز ہوتے ہیں۔
اس کلیہ کے اعتبار سے کتابوں کے جملہ حقوق محفوظ کر لینا بھی مصنف کا آئینی حق ہے تاکہ پوری کتاب یا اس کے چند اقتباسات سرقہ چربہ استفادہ استحصال کے علاوہ ناجائز طور پر برتے جانے سے محفوظ ہو جائیں۔ قاری کتابوں کو بعوض قیمت خرید کر پڑھیں تاکہ مصنفوں خوشنویسوں پرنٹروں پبلیشروں کے ساتھ کتب فروشوں کو بھی مالی منفعت کا وظیفہ ملتا رہے۔ ہر چند کہ کتاب آمدنی کا کوئی بہت موثر ذریعہ تو نہیں ہے پھر بھی چار افراد کی کفالت کا وسیلہ بن جائے تو غنیمت ہے ورنہ اس دور آگہی میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے جدید ذرائع ابلاغ نے مذکورہ بالا پیشہ وروں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔
آج ان پیشہ وروں کا شغل جہاد عظیم سے کسی قدر کم نہیں ہے جنہیں نہ اپنے آپ سے ہمدردی ہوتی ہے نہ اپنے اہل وعیال ہے۔ مگر ان کا جوش جنوں انہیں اپنے شوق کی تکمیل میں اکثر و بیشتر افلاس، تنگ دستی کے سنگلاخ سے گذرتا ہے اور وہ اس خندہ پیشانی سے اس راہ پر خار سے گذر جاتے ہیں گویا تفریح کی غرض سے ٹہلنے نکلے ہوں۔

اکثر کتابوں کے جملہ حقوق ایسے اشخاص کے نام معنون ہوتے ہیں جن سے یا تو مصنف کا قریبی رشتہ ہوتا ہے یا گہری عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ اس پایہ امتیاز کو پہنچنے کے لئے عمر رسیدہ ہونا کوئی باقاعدہ شرط تو نہیں مگر کتاب کی مقبولیت اور اشاعت ثانیہ کے آتے آتے ان کی عمر عزیز وفا کرے نہ کرے "کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک" اکثر افراد جو جملہ حقوق محفوظ ہونے کا افتخار رکھتے ہیں مرحوم کی فہرست میں آجاتے ہیں۔ اس پر آشوب دور میں جہاں عوام کی کتب بیزاری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ کتابوں کے پہلے ایڈیشن کی جملہ فروختگی ہی خطرے میں ہوتی ہے۔ پبلیشر کو اپنی رقم لوٹ آنے کا یقین کم اور انتظار زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مرحومین سے پیشگی اجازت کے لئے قاری کو ملک عدم کا سفیر ہونا پڑے گا اور رائلٹی ادا کرنے کا واحد ذریعہ اور دعائے مغفرت رہ جاتی ہے۔ انگریزی کتابوں پر تنبیہ درج ہوتی ہے کہ قارئین کتابیں یا ان کے اقتباسات کی نقل فوٹو کاپی اور عکس بندی نہ کریں ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔
ان کتابوں کے جملہ حقوق محفوظ بھی ایسے افراد کے نام ہوتے ہیں جو یا پردیس (مغربی ممالک) کے باسی ہوتے ہیں یا سورگباسی ہو جاتے ہیں۔ تنبیہ لکھنے والے کو بھی کوئی اندازہ ہوگا کہ سارق طلباء اور قارئین جن کو ہر قسم کی فضول خرچی اور بسیاری خوری کا افتخار حاصل ہے صرف کتابیں خریدتے وقت ہی ان کا معاشی قافیہ تنگ ہو جاتا ہے لہٰذا وہ موقع کے اعتبار سے اپنے مطلوبہ اقتباسات کی فوٹو کاپی کروا لیتے ہیں جس کی خبر مصنف صاحب جملہ حقوق اور پبلیشر تو دور ان کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ اس طرح مذکورہ حضرات کتاب خریدنے کے بارے بھی بچ جاتے ہیں اور ساری کتابی تنبیہات دھری کی

دھری رہ جاتی ہیں۔

عصرِ حاضر میں جہاں Paper Free کے ساتھ ساتھ Dust Free ماحول کی تیاری زوروں پر ہے علم کی ترویج و اشاعت سے زیادہ درختوں کی بقاء کی فکر لاحق ہے وہاں مذکورہ بالا منچلے پیشہ ور غالباً پتھروں کے دور کے معلوم ہوتے ہیں اور تادمِ تحریر اس قدیم روایت کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اولاً تو میں نہ کوئی باقاعدہ مصنف ہوں نہ میری کوئی کتاب ہے (غلطی سے ہوگئی ہے)۔ اگر میں کسی کتاب کا مصنف ہوتا تو جملہ حقوق غیر محفوظ چھوڑ دیتا اور یہ بھی ضرور رقم کرتا کہ جہاں چاہے جیسے چاہے کتاب یا اقتباسات کی نقل، فوٹو کاپی یا عکس بندی کریں مگر اس کتاب سے علم حاصل کریں اس کے اقتباسات کو کسی کی تحقیر یا طعنہ زنی کا سبب نہ بنائیں نہ ایسے حوالے دیں اس کا جائز استعمال کریں اور استحصال سے گریز کریں مگر ضرور بضرور پڑھیں تاکہ ہم سب مل کر جسٹس راجندر سچر کی رپورٹ کو جھوٹا ثابت کرسکیں۔ موصوف نے اقلیتوں کی صرف عیب جوئی کی اور خوبیوں کو صرف نظر کر کے ممتاز ہو گئے۔

یہ بڑی تلخ سچائی ہے کہ مصنف کتاب کی تیاری میں بہت پر جوش رہتا ہے۔ جیسے شادی سے قبل نوشاہ۔ وہ اپنی نگارش کی ہر ممکن نوک پلک سنوارتا ہے اور کتاب میں ہر ان روایتی خوبیوں کے اضافے کی تگ و دو شروع کر دیتا ہے۔ نگارشات کے نسخے تنقید و تجزیئے کی خاطر اکابرینِ فن حضرات کو بھیجے جاتے ہیں جن کو یوں تو وقت ہی وقت ہوتا ہے مگر نظرِ ثانی کا وقت کم ہی ہوتا ہے۔ کوئی صاحب عقیدتاً دیباچہ پیش لفظ یا اپنی بات لکھ کر روانہ کرتے ہیں کوئی بقدر استعداد سوانحی خاکے اور پس منظر پر طبع آزمائی کرتا ہے تو کوئی ظاہری ہیئت۔ سرورق تا بالخیر، کتابت، طباعت اور اوراق کی جنس پر انگشت نمائی کرتا ہے کوئی اپنی علمیت کا بخار نکالنے کے لئے کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذاتیات پر بھی رقیق جملے کر کے اسے شفقت کا عنوان دیتا ہے۔ کسی کو مضحکہ خیز بے تکلف داستان پر دسترس ہوتی ہے۔ بعض اوقات ادیب کو ایسے ادیبوں کے کلام کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے جن کی وقعت مصنف کے نزدیک دو کوڑی کی بھی نہ ہو۔ خون نقطۂ جوش تک پہنچ جاتا ہے مگر پھر اسے انجماد کی طرف راغب کرنا پڑتا ہے۔ دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔ الغرض کوچہ یاراں کے ترکش سے نکلے ہوئے سارے تیر راست مصنف کے دل پر لگتے ہیں۔ گہرے گھاؤ پر مرہم رکھنے کا مداوا چند رسمی تصنع آمیز تعریفی و توصیفی خطوط کے علاوہ موصولہ مبارکباد سے ہوجاتا ہے گویا آبیل مجھے مار، گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔

مگر ذوق تشنگی ابھی کہاں نصیب! پبلیشر کے اصرار اور جزوی مالی تعاون کی ایماء پر رسم اجراء ہوتا ہے۔ پبلیشر کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کو پبلسٹی ملے اور عوام کے خوابیدہ کانوں کو خبر تو ہو کہ یہ کوئی نئی تصنیف بھی بازار میں قدم رنجہ ہونا چاہتی ہے اس لئے مشہور و معروف اخبارات میں مراسلے اور اشتہارات کے تجارتی ہتھکنڈے بھی روبہ عمل لائے جاتے ہیں پھر صدارت کی خاطر کسی صاحب مال و زر کی تلاش درکار ہوتی ہے جو اعزازیہ (کئی گنا زائد) قیمتیں دے کر خرید سکتے ہوں مگر ان کا نہ تو کتاب سے علاقہ ہوتا ہے نہ اس میں شامل مواد سے سروکار۔ انہیں ادب نوازیت، نیک خلقی کے ساتھ علم دوستی کے القاب درکار ہوتے ہیں۔ حقیقی شائقین سامعین کی صفوں میں تالیاں بجا رہے ہوتے ہیں جیسے قوالوں

کی پارٹی کے ہم نوا حقیقی شیدائی فن کی باریکیوں پر داد تحسین کے تحفوں سے نوازتے ہیں۔ کچھ مقررین تو قرار واقعی فن کی ستائش اور خوبیوں کا ذکر کر کے مصنف کا سینہ گز بھر کا کر دیتے ہیں۔ بعض بے موقع بے محل اپنی فوقیت جتانے کی خاطر ایسی ایسی تنقید یں کرتے ہیں جن کو سن کر مصنف نہ صرف پیچ وتاب کھاتا ہے بلکہ وہ مقرر کے حق میں بد دعا کرنے سے بھی باز نہیں رہتا۔ مگر چہرے پر وہی نمائشی تبسم۔ بعض مقررین و ناقدین ایسی ایسی خوبیوں کا تذکرہ کر دیتے ہیں جن کا خیال تک مصنف کے ذہن میں اجاگر نہ ہوا ہو بلکہ مصنف کے فہم و ادراک کی رسائی بھی ان مقامات تک نہ ہوئی ہو۔ اخیر میں صاحب اعزاز یوں اٹھتا ہے جیسے الیکشن میں جیتا ہوا لیڈر گلا صاف کر کے صدر، پبلیشر، پرنٹر، خوش نویسوں کے ساتھ ادب نواز سامعین اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ بعض اوقات ان کے ردِ عمل پر اپنا ردِ عمل پیش کر کے رہی سہی بھڑاس نکال لیتا ہے۔

ہماری عقل ناقص کے لئے معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا کہ آخر اس تانے بانے کا نتیجہ کیا نکلا۔ عصر حاضر کے مادی دور میں ہر شئے کا نتیجہ خیز ہونا نہایت اہم ہے ورنہ یہ وقت محنت رقم وسائل اور فن کا زیاں قرار پاتا ہے۔ اب اس مرحلے میں آپ کہیں اصلاح کا پہلو سوجھے تو احقر کو ضرور بضرور مطلع فرمائیں تا کہ مصنفوں کو اس روایتی خواری سے نجات کی سبیل تو نکلے۔

ہوئے جب مضمحل قویٰ غالب

جب جوانی کا سورج زوال پذیر ہو کر ضعیفی کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو انسانی کیفیات میں عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ضعیفی اپنے ساتھ جانے کتنے حیلے بہانے، عذر وراہ فرار کے حربے کے ساتھ لاتی ہے۔ عفوو درگذر کا مادہ کم ہو جاتا ہے۔ توقعات پہلے سے زیادہ جوان ہو کر رشتوں کا امتحان لیتی ہیں جہاں ضعیفوں کی خواہشات کی عدم تعمیل ہوئی یا موصوف کو نظر انداز کیا گیا تو غصہ ناک کی نوک سے پھسل کر زبان کی ناک پر آجاتا ہے۔ نسل نو کو فوراً زبانی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ نسلی فاصلہ رفتہ رفتہ ہر رشتے میں فاصلے کا سبب بن جاتا ہے۔ جوانی کی خرمستیاں بڑھاپے میں اختلاج کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جہاندیدہ ہونے کے باوجود مطلوبہ قدرومنزلت سے محرومی اور محدود اختیارات کے باعث جھلاہٹ طوفان کی طرح اپنے اخراج کا راستہ ازخود پیدا کر لیتی ہے جسے نسل نو "بڑھا کھوسٹ سٹھیا گیا ہے" سے تعبیر کرتی ہے۔

ہو گئے مضمحل قویٰ ، غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

یوں تو سب سے کامیاب بڑھاپا وہ ہے جس میں کماؤ پوت ناز برداریاں اٹھاتے ہوں، والدین کے ہر حکم کے پابند ہوں۔ مگر آج کے پرفتن دور میں خود غرضی، مصروفیات، مقابلہ آرائی اور اخلاقی اقدار کی پستی نے رشتوں کے معیار کو یکسر بدل دیا ہے۔ لہٰذا بڑھاپا مزید مشکل اور صبر آزما ہو گیا ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار نے نسل نو سے تمام مشرقی آداب اور خدمات کا جذبہ چھین لیا ہے۔ اب تو بزرگ موصوف جو خود خانماں خراب ہوتے ہیں ان کے گھر کا یہ حال ہوتا ہے کہ بیٹے بے لگام، اپنے والدین سے زیادہ سسرال کے تابع وفرماں بردار اور زن مرید ہوتے ہیں۔ گھر میں بہو کے سر پر حکمرانی کا تاج ہوتا ہے۔ خود بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ "یا شیخ، اپنی دیکھ" کی بجائے اپنی بیٹیوں کی سسرال پر نظریں گاڑے رہتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں اپنی سسرال میں کیسے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ملازمت بھی کرتی ہیں امور خانہ داری بھی۔ بچوں کی پرورش بھی اور ہٹلر نما شوہر کے احکامات کی پابند بھی۔ مرے پر سو دُرے کے مصداق دور و قریب کے دیگر سسرالی رشتہ داروں کی ناز برداریوں کی برہنہ تلوار بھی ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ یعنی "جو مضمون ادھر ہے، وہ مضمون ادھر بھی۔" ان کی بیٹیاں بھی اپنی سسرال میں تخت نشین ہوتی ہیں۔ وہاں بھی ان کے نام کا سکہ رائج ہوتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، دوسروں کی آنکھ کا تنکا نظر آ جاتا ہے بلفظ دیگر "چراغ تلے اندھیرا"۔

ضعیف العمری کا یہ تقاضا بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں گھرے رہیں۔ ان سے

شفقت اور والہانہ محبت کا اظہار کریں لیکن پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی نسل جدید ہے۔ نانا، نانی، دادا، دادی سے ان کی ضعیفی کو بالائے طاق رکھ کر بدتمیزیاں کرتی ہے۔ بے جا لاڈ و پیار کی متقاضی ہوتی ہے اور ان کی جیب میں جو چند روپے ہوتے ہیں ان میں اپنے حصے کا دعویٰ ٹھونک دیتی ہے۔

ضعیفی کا ایک دشوار ترین تقاضہ یہ بھی ہے کہ بڑے میاں ہمہ وقت اس سوچ میں گم ہوتے ہیں کہ ان کی اہلیہ چوبیس گھنٹے موصوف کی خدمت عالیہ میں حاضر رہیں کہ کب حضور کو کون سی ضرورت درپیش ہو۔ وہ زبان سے نکلتے ہی پوری ادا کر دی جائے۔ حضرت یہ نہیں سمجھتے کہ اگر خود ساٹھ باسٹھ کے ہیں تو ان کی اہلیہ بھی کم از کم انسٹھ ساٹھ کی تو ہوں گی ہی۔ یا اگر عمر کا تناسب معکوس ہوا تو اہلیہ محترمہ ترسٹھ چونسٹھ کی بھی ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات درست ہے کہ بڑھاپے کا دوسرا نام ہی "مخبوط الحواسی" ہے۔ لہٰذا یوں ہوتا ہے کہ ادھر تیر کمان پر چڑھے تو ادھر بھی توپ سے گولے داغے جانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ میدان کارزار گرم ہو جاتا ہے۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

ہر چند کہ بیوی کی شکایات، نوک خار مغیلاں کی طرح دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ درد و آلام کا دفتر کھل جاتا ہے۔ بہوؤں کی شکایتیں اور بیٹوں کی عدم توجہی کے گلے شکوے۔ لہٰذا لامحالہ بزرگ کو خیال آتا ہے کہ

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بزرگ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں اپنے بیٹوں بیٹیوں کے چہرے کے نقوش، شکل و شباہت، عادات و اطوار کے علاوہ فطرت و خصائل کے آثار تلاش کرتے ہیں۔ گویا وہ متاع گم گشتہ ہوں۔ ان کی نشاندہی کر کے خوش ہوتے ہیں اور ان کو یا تو اپنے بچوں یا اپنے اجداد سے منسوب کر کے یاد کرتے ہیں۔ اپنے موجودہ مراتب کو فراموش کر کے نسل نو کی خوشنودی کے لئے عجیب و غریب شکلیں بنا کر، آواز و لہجہ تبدیل کر کے، بچکانہ عناصر پیدا کر کے بچوں کو مخاطب کرتے ہیں تاکہ اپنی نسل نو کے چہرے پر شگفتہ تبسم دیکھ سکیں۔ لہٰذا بارہا بچپن اور پچپن کا فرق مٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ ضعیف بزرگ ان بچوں میں اپنے بچپن کی محرومیوں اور نارسائیوں کی حتی الامکان تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ بچکانہ بات چیت، لب و لہجہ اور ذہنی سطح اختیار کر کے ہر خوشی کو پورا کرنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ تاکہ نسل نو پھولے پھلے، سلسلہ نسب پروان چڑھے ان کے وارثین کے ساتھ ان کا اپنا نام بھی قائم و دائم رہے۔ چوں کہ سود ہمیشہ اصل سے پیارا ہوتا ہے پھر بھی احساس رہتا ہے کہ

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

نسل نو اپنی حرکات و سکنات، تاثرات اور سلوک سے بزرگوں کو یہ باور کراتی ہے کہ وہ اب اپنی عمر جی چکے ہیں اور اپنی زندگی کے سفر کے تقریباً آخری پڑاؤ پر ہیں۔ اب نہ تو اعضاء میں وہ قوت ہے نہ ان کے دور کے آداب و اطوار رائج ہیں۔ نہ ان کے تجربات کارگر ہیں۔ نہ اب وہ ارزانی ہے۔ جو قصہ پارینہ بن چکی ہے لہٰذا اپنی سنہری یادیں اور اپنے رائے مشورے اپنے پاس رکھیں۔ نسل نو کو دور جدید کے تقاضے، مقابلہ آرائی اور جدید اقدار کے شانہ بشانہ چلنے کا موقع دیں۔ ہر بات پر اپنے سابقہ تجربات کا دفتر لے کر دخل اندازی سے نسل نو کو معاف رکھیں۔ بلاوجہ روک ٹوک نہ کریں۔ مزاج دلی سے نسل نو کی خوبیوں کو سراہیں۔ خامیوں پر طعن و تشنیع اور حوصلہ شکنی کے بجائے مشفقانہ نشاندہی کریں۔ ماضی کے فخریہ حوالوں سے تو ان کے وقت کا زیاں اور اپنی کم مائیگی کے احساس میں اضافے کا احتمال ہوتا ہے۔

دنیا نے چھین لی میرے چہرے کی رونقیں
اب گھر کا آئینہ مجھے پہچانتا نہیں

ان کی یہ اس سرکشی پر بزرگ حضرات کو جلال آجاتا ہے۔ جہاں ان کے تجربات اور تاثرات کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

بعض بزرگوں کے ہاں جب نسل نو کی بے باک حرکتیں ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تب وہ عمر کے اس آخری پڑاؤ پر گھر کے افراد سے برگشتہ ہو کر، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ''ملا کی دوڑ مسجد تک'' کے عامل ہو جاتے ہیں۔ سادہ لباس، باریش، باقاعدہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو جاتے ہیں۔ مذہبی رجحانات میں گوشہ عافیت تلاش کرتے ہیں۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اللہ اللہ کر کے سارا دن گذارتے ہیں۔ مسجد کے معمولات کے علاوہ فاضل اوقات میں معمولی سودا سلف وغیرہ خریدتے ہیں جن پر کبھی بیگم صاحبہ کو اعتراض ہوتا ہے تو کبھی بہوؤں کو۔ بہوئیں اپنے خسر سے حرف شکایت بیان نہیں کرتیں مگر تخلیے میں شوہر کو سرگوشی میں ساری روداد گوش گذار کر دیتی ہیں۔ نتیجتاً بیٹے اپنے والد سے رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے اختیارات اپنے حق میں منتقل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا بزرگوں کو یہی احساس غالب رہتا ہے کہ ''ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے''۔

سلوٹیں یوں ڈال دیں چہروں پہ ظالم وقت نے
جیسے کوئی ریشمی کپڑے کو مل کر چھوڑ گیا

حیرت سے نہ دیکھو مرے چہرے کی دراڑیں
میں وقت کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح ہوں

بزرگوں کا ایک گروہ ضرورت سے زیادہ تنگ نظر اور آمرانہ اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنوں کی تمام خطائیں درگذر کرتا ہے مگر جہاں کہیں غصے، جھلاہٹ یا مزاج کی گرانی کا اخراج مقصود ہوتا ہے تو انہیں پھر غیروں کی بیٹی بطور بہو مل جاتی ہے لہٰذا ان کا واحد مشغلہ سارا دن بہو کی نگرانی، ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک ہوتا ہے۔ وہ بہوئیں موقع پاتے ہی تنہائی میں شوہروں سے حد درجہ احتیاط کے ساتھ شکاتیں کر کے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکال لیتی ہیں۔ شوہر بے چارہ اپنے جلاد نما والد کے آگے بے بس اور ان کے کروڑوں احسان تلے دبا ہوا ہوتا ہے لہٰذا خاموشی سے خون کے گھونٹ پینے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ فرماں بردار اور سعادت مند بیٹے کے تصور کو زندہ رکھ کر، غیر ارادی طور پر، اپنے والد محترم کے نظریئے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لہٰذا سربراہ خانوادہ بیٹے کو محکوم وحقیر جان کر بہو پر ظلم روا رکھتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ موقع پرست ساس بھی بہوؤں کو خسر کے تیور سے خوفزدہ کر کے نہ صرف خسر کی جملہ خدمات کرواتی ہیں بلکہ اپنا اُلو بھی سیدھا کرتی ہیں۔ اب مظلوم بہوؤں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ دعا گو ہوں" ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"۔

داخلی معاملات کے علاوہ بعض بزرگوں کو غصہ یا جھلاہٹ ظاہر کرنے کے اور بھی بہانے میسر آتے ہیں۔ مثلاً مسجد میں ضعیف العمر حضرات کو یہ فکر ہو جاتی ہے کہ موذن اپنی تنخواہ حلال کر رہا ہے یا مفت خور ہے؟ صفائی کے لئے معمور عملہ اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر نبھا رہا ہے یا کوتاہی کر رہا ہے۔ جہاں موصوف کے اہل خانہ بھی ان کو منہ نہیں لگاتے وہ خدائی خدمت گار بن کر اس طرح کے کمزوروں پر اپنا بخار نکالتے ہیں۔ اپنا غصہ فرو کر کے وقتی تسکین کے متقاضی ہوتے ہیں کہ کہیں بالادستی میسر تو ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اکثر ضعیف حضرات اپنی وضع قطع اور خوش لباسی میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالوں کو وقتاً فوقتاً مہندی یا خضاب سے رنگین بناتے ہیں تا کہ عہد رفتہ کی رنگینیاں اور جوانی کی سرمستیاں کسی قدر قائم رہیں۔ اعلیٰ قسم کے لباس، چشمے، جوتے، گھڑیاں، پین استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں میں ذوق سے زیادہ عمر میں تخفیف کے شوق کا دخل ہوتا ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی ہفتے میں دو تین مرتبہ چہرہ بنوا کر بشرے کو تر و تازہ رکھنے کی سعیٔ ناتمام جاری رہتی ہے۔ اگر کسی نے ٹوک دیا کہ صاحب آپ تو بہت کم عمر معلوم ہوتے ہیں تو لہک لہک کر اپنی عمر عزیز کی تقسیم کا تصفیہ کرتے ہیں۔ سننے والا بھکی بھکی بوڑھی زبان سے جوان باتوں کو سنتا ہے پھر چہک چہک کر چٹخارے لے کر اشاروں کنایوں میں حوالے بر موقع بر محل استعمال کرتا ہے۔

ضعیفی میں انسان ماضی میں جینے کو ترجیح دیتا ہے۔ حال پر اکثر قانع اور شاکر نہیں رہتا اور مستقبل کی فکر سے

کبھی تو نہایت فکر مند اور کبھی آزاد ہو جاتا ہے۔ راتوں کو نیند کم آتی ہے۔ دن بھر عجیب اختلاج اور ہیجان سر پر سوار ہوتا ہے۔ یہ پتہ ہوتا ہے کہ بڑا سفر درپیش ہے مگر وہ دنیا سے محبت اور اپنی اولاد، جاگیر اور زندگی سے الفت کے سراب کے پیچھے سرپٹ دوڑتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی اپنی تسکین کے عوامل تک نہیں پہنچ پاتا اور مزاج کی بے چینی اور اضطراب یوں ظاہر ہوتا ہے کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عوام ان کے اضطراب، غیر معتدل مزاج اور نفسیاتی ہیجان سے خوفزدہ رہتے ہیں یا تو اپنی عزت کے خوف سے یا ضعیفی کے لحاظ میں ورنہ زبانِ زد خاص و عام یہی ردِ عمل ہوتا ہے کہ "بڈھا کھوسٹ سٹھیا گیا ہے۔"

بارے جوتوں کا کچھ بیاں ہو جائے

اسے ہم اپنی نادانی اور کج فہمی پر محمول کریں گے کہ اب تک ہم جوتے کے اس قدر کثیر المقاصد ہونے سے لاعلم تھے۔ ہماری عقل ناقص میں جوتے راہ پر خار اور سنگریزوں سے پیروں کی محافظت کے لئے ہی مستعمل تھے۔ مگر رفتہ رفتہ جوتوں کے کچھ خواص ہم پر اس طرح منکشف ہونے لگے کہ ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ افراط وتفریط کے مسائل رونما ہوں تو جوتا دال بانٹنے کے کام آتا ہے۔ عموماً مشترکہ خاندانوں میں جوتوں میں دال بٹنے کا بیج خواتین بوتی ہیں۔ لہٰذا اسی سبب جب ایک بھرا پرا، شاد و آباد خاندان نظر بد کا شکار ہو کر بکھر جاتا ہے تو سب سے زیادہ مسرت اس خاندان کی موصوفہ خواتین کو ہی ہوتی ہے۔

خوش ہو گئیں وہ جوتے میں جب دال بٹ گئی
مطلب کی ان کی بات تھی فوراً ہی پٹ گئی

خوشامد پرست حضرات خوشامد پسندوں کے پیروں میں سر دے کر "حضور آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے" کہہ کر اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ جوتا مارنا بھی ایک فن ہے جوتا شال میں لپیٹ کر بھی مارا جاتا ہے۔ جوتوں سے متعلق محاوروں میں اس محاورے کا انداز جہاں شاعرانہ ہے وہیں شاطرانہ بھی۔ دراصل یہی ہے شال میں لپیٹ کر جوتا مارنا جسے ہم نثری شاعری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ الفاظ کی شال میں الفاظ کے جوتے لپیٹ کر یوں مارے جاتے ہیں گویا مضروب "جوتے کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا" کی زندہ مثال بن کر رہ جاتا ہے۔ ان پر لطف معنویت کے حامل الفاظ کو یا تو کوئی نقطہ شناس سمجھ سکتا ہے یا فریقین جن کے مابین جوتا پیزاری جاری ہوتی ہے۔

روزمرہ کے معمول و مشاہدے کا حصہ ہے کہ کسی بے غیرت عاشق کا ایک شریف اور غیرت مند لڑکیوں کی جوتیوں سے پٹ جانا یا کسی نکھٹو شوہر کا برسر روزگار بیوی کی جوتیوں سے تواضع کیا جانا یہاں معاملہ معکوس ہو جاتا ہے کہ ایک طرف غیرت اور دوسری طرف بے غیرتی۔ شریف الطبع لڑکی ہو یا حلیم و بردبار بیوی ان کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب بے غیرت عاشق اور نکما شوہر، دونوں اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں یعنی جوتوں سے مرمت ہو جاتی ہے تب وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے ان کو پیش جوتی ایک دن

اگر جوتا مارنے کا انتہائی اشتیاق ہو تو بغداد کے معصوم صحافی منتظر الزیدی کی طرح اخلاقی جرأت کا وصف پیدا

کریں تا کہ جوتوں کی قدرومنزلت کے ساتھ ساتھ قیمت میں بھی ناقابل یقین اضافہ ہوجائے۔آپ کو بھی سرآنکھوں پر بٹھایا جائے اور بین الاقوامی تشہیر بھی ہوجائے۔بس ہدف کا انتخاب ہی فنکاری کا متقاضی ہے۔ہر انصاف پسند آپ پر رشک کرے گا بابانگ دہل کہ اٹھے گا۔

نصیب بگڑا ہو اس طرح سنواروں گا

کسی وزیر کو جوتا چلا کے ماروں گا

ہندوستانی قوم کو غیر ملکی عادات و اطوار کی تقلید بلکہ سرقہ چربہ اور استفادے کا اعزاز حاصل ہے۔اسی بناء پر ہندوستان میں بھی مندرجہ بالا طرز پر کامیاب تجربات کئے گئے ہیں۔

جوتے خواہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں سر پر نہیں پہنے جاسکتے۔جوتوں کا مقام پیروں میں ہے اور پیروں میں ہی جچتے ہیں۔فی زمانہ جوتوں کو تشخص کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔یہ دیدہ زیب جوتے اور جوتیاں جہاں مردانہ وجاہت میں اضافے کا باعث سمجھے جاتے ہیں وہیں زنانہ نزاکت اور حسن و زیبائش کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔انہی شاندار جوتوں کی محبت اکثر و بیشتر خالق و مخلوق میں پردہ بن کر حائل ہوجاتی ہے۔بطور خاص بوقت نماز یوں بھی ہوتا ہے کہ

آخری صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

تا کہ جوتوں کی حفاظت بھی رہے وقت نماز

یہ ہماری خام خیالی ہی ہے کہ ہم جوتوں کو بطور آلۂ پیمائش برتنا چاہتے ہیں۔بیٹا اگر کوئی کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے تو لوگ کہتے ہیں بیٹا تو باپ سے بھی چار جوتا آگے نکلا۔اساتذہ، بزرگوں اور والدین کی تعظیم و تکریم کا پیمانہ ہے ان کی جوتیاں سیدھی کرنا۔جب باپ کا جوتا بیٹے کے پیروں میں آنے لگے تو یہ پیمائش اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ بیٹا شادی کے لائق ہوگیا ہے۔لہٰذا والدین کے کان کھڑے ہوجانے چاہئیں۔دیدہ دلیری کا پیمانہ ہے آنکھوں میں جوتے پہن کر گھس جانا۔

جوتے گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر مہنگے ہوگئے ہیں کہ ہمہ اقسام کے تاجوں، ٹوپیوں اور کلاہ پیاخ پر سبقت لئے جارہے ہیں۔لہٰذا ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم انہیں اپنے سر پر رکھ لیں۔تا کہ ان کے گراں قدر ہونے کا حق ادا ہوجائے مگر تشبیہہ نمرود سے خوف آتا ہے کہیں ناظرین کا ذوق انہیں عملی طبع آزمائی کی دعوت نہ دے بیٹھے۔چوں کہ مچھر بھی بے شمار ہوگئے ہیں جانے کوئی مچھر کس کی ناک میں کب گھس جائے اور عوام الناس کو جوتا پیزاری کا لطف آجائے۔

بعض ناعاقبت اندیش حضرات کو بازار سے جوتے خریدنے میں جیب ہلکی ہوجانے کا خوف ستاتا ہے۔پھر جوں جوں جوتوں کا معیار بلند ہوتا ہے قیمتیں بھی فزوں تر ہوتی جاتی ہیں۔لہٰذا وہ مسجد کا رخ کرتے ہیں۔اس لئے نہیں کہ خدا کو یاد کریں یا خدا سے جوتے طلب کریں جو ہر چیز پر یکساں قادر ہے۔ان کی نیت میں جوتے پڑے ہوتے ہیں اس لئے وہ جوتے چرانے کی غلطی بھول سے کر بیٹھتے ہیں پھر دیکھیں انہیں کیسے خدا یاد آتا ہے۔

جوتوں کے انتخاب کو مسجد میں وہ گئے

وہ جوتیاں پڑیں کہ خدا یاد آ گیا

ضرب کلیم سے ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔ ہزل نگاروں کے سر پہ جب پاپوش (جوتوں) کی ضرب پڑتی ہے تو ان کے دماغ سے ہزل کے ہزاروں سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ جن میں جوتے ہی جوتے نظر آتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جوتوں کا سب سے خوبصورت، بے شمار، بااعتبار اور بے اختیار استعمال ہزل گو شعراء نے ہی کیا ہے۔ جوتوں کی جتنی زیادہ مؤثر انداز میں تشہیر ہزل گو شعراء نے کی ہے وہ آزمودہ کار اشتہاری کمپنیوں کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔ خود جوتے ساز کمپنیوں کے وہم وگمان میں یہ بات نہیں رہی ہوگی کہ جوتے اس قدر کثیر المقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

تنہا گھر بھر سے لڑے ہوں تو ہزل ہوتی ہے

سر پہ جب جوتے پڑے ہوں تو ہزل ہوتی ہے

تن پہ سوٹ پاؤں میں جوتے پھٹے ہوئے

ہنستے ہیں سب چمار مجھے دیکھ کر

اس کو کہتے ہیں مقدر اس کو کہتے ہیں نصیب

رات ان کی بزم میں جوتا چلا تھا میں نہ تھا

ان کی جوتی کے تلوے پہ فوٹو مرا

قرب ان مجھے ایسے حاصل ہوا

اب شب ہجر خوب گذرے گی

ان کی جوتی چرا لے لایا ہوں

مندرجہ بالا اشعار کے ذریعے عشاق نے جوتوں کی جتنی عزت افزائی کی ہے وہ شاید ہی کسی اور کے بس کی بات ہو۔ اس معاملے میں عشاق کی خوش گمانی اور دور اندیشی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

رشتۂ نسبت کی شروعات بھی رسم جوتا چرائی سے اس قدر استوار ہو جاتی ہے کہ

ساری خدائی ایک طرف

جورو کا بھائی ایک طرف

اخیر میں جوتوں کا جو تاریخی استعمال ہوا ہے اسے ضبط تحریر میں لانا مضمون کی صحت کے لئے لازمی ہو جاتا ہے۔ وقت کے نمرود اور راوربش جیسے بد دماغوں کا دماغ درست کرنے کا واحد کارآمد ہتھیار ہے جوتا۔

نہ توپوں نے نہ بش کو راکٹوں نے مارا

اسے مارا تو دو جوتوں کے خالی وار نے مارا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

خطابات ہر زمانے میں عزت، عظمت، وقار، مقبولیت اور کشش کا مظہر تسلیم کئے گئے ہیں اور کئے جاتے رہیں گے۔کسی بھی فنکار کو اپنے فن کے مظاہرے میں یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ امتیازی حیثیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔خطابات کے حصول کے لئے فن اور صلاحیتوں کا غیر معمولی مظاہرہ اولین شرط ہے ان خصوصی اور گوناگوں اساسی شرائط سے متاثر ہو کر بادشاہ، حکومت یا انجمنیں ایسی چیدہ چیدہ شخصیات کو خطابات تفویض کرتی ہیں تاکہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں اور فن کا اعتراف کیا جاسکے۔

فی زمانہ خطابات کے دم چھلے اپنے حامل کے اسم خاص سے منسلک ہو کر صاحب خطاب کا سینہ دائما گز بھر کا کر دیتے ہیں اور انہیں اترانے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔بدلتی ہوئی اقدار نے پیمانۂ انتخاب کو مخصوص نئے عوامل سے آشنا کر دیا ہے جو پس پردہ متحرک ہوتے ہیں یعنی مندرجہ بالا اساسی عوامل کے ساتھ مخصوص نئے عوامل بھی مرحلہ انتخاب میں در آئے ہیں۔جیسے رشتے ناتوں کے نازک بندھن، سفارشات اور وسیلے بھی خاص اہمیت کے حامل ہوتے جارہے ہیں۔دوسرا طریقہ مرحلۂ انتخاب میں چور راستے پیدا کر کے ابن الوقتوں نے مذکورہ امر کو قدرے سہل اور قابل خرید و فروخت بنادیا ہے تاکہ ایک طرف جیوری دماغ پاشی سے محفوظ رہے اور ججوں کو بھی مالی منفعت حاصل ہو۔اپنے ابتدائی دور میں آج کے مشہور و معروف فلمی ہیرو بھی اس آنکھ مچولی کے ملزم رہ چکے ہیں۔غالباً وہ اس وقت اناڑی تھے اور اب اس فن کے پختہ کار کھلاڑی ہیں۔

کبھی سیاسی مصلحت کے پیش نظر ایسے اشخاص کو بھی خطابات بطور رشوت پیش کئے جاتے ہیں جن سے سیاسی بازیگری میں رخنہ اندازی اور ارباب حکومت کے عیوب آشکارا ہو جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔خطابات کے حصول سے سرورِ اور نشے میں مذکورہ حضرات خود بھی خواب غفلت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور عوام کو بھی تھپکیاں دے کر سلا دیتے ہیں۔خطابات کی تقسیم میں اربابِ حکومت اپنے مطیع اور ہمنواؤں کا خاص خیال رکھتے ہیں تاکہ آئندہ انتخابات میں ان کی وفاشعاری برقرار رہے۔تقسیم ہند کے وقت صوبہ سرحد کے کانگریسیوں کو مسلم لیگیوں کے سپرد کرتے وقت خطاب سے نوازا گیا تھا۔ماضی میں متعدد ایسے رہنماؤں کو قابل فخر اور گرانقدر خطابات سے نوازا گیا ہے جو بوفورس سودے کی رشوت ستانی میں ملوث تھے اور ان مقدموں کی سماعت عدالت عالیہ میں جاری تھی۔بعض ایسے سیاسی رہنماؤں کو مجاہد آزادی کا خطاب اور ذیلی مراعات تفویض کی گئی ہیں جو یوم آزادی کے وقت لڑکپن یا شیر خواری کے مزے چکھ رہے تھے۔

انگریزوں کے دور حکومت میں تحریک عدم تعاون اور ترک موالات کے دوران بہت سے وطن پرست

رہنماؤں نے انگریزوں کو "سر" کا خطاب لوٹا کر اپنے حب الوطن اور مجاہد آزادی ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔ مگر آج اس عمل کو دہرانے والے پر حکومت کا عتاب نازل ہوتا ہے۔ مفاہمتی سیاست بھی خطابات کے مرحلۂ انتخاب کا مرکز ہوتی ہے۔ اب مرحلۂ انتخاب میں قابلیت کے اساسی عوامل پر نئے خصوصی عوامل مثلاً سفارش، رشوت، سیاسی مصلحت پسندی کے عناصر بھی اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ خطابات نے اپنی وقعت اس قدر کھو دی ہے اکثر صاحبان جو خطابات کے لئے نامزد کئے جاتے ہیں تقریب خطاب میں شرکت بھی گوارا نہیں کرتے۔ جس وقت انہیں خطابات تفویض کئے جانے ہوتے ہیں اس وقت وہ بیرون ممالک کے دوروں پر ہوتے ہیں تاکہ عوام کو باور کرا سکیں کہ ان کی نظروں میں ان خطابات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ انہیں حکومت کے تفویض کردہ خطابات سے غرض ہے نہ ان سے منسلک مالی مراعات سے جو خطابات کے ذیل میں عطا کی جاتی ہیں۔ خطابات کی وقعت اس قدر انحطاط پذیر ہو چکی ہیں کہ صاحب خطاب اپنی بات منوانے کی خاطر یا حکومت سے اختلافِ رائے کے سبب حکومت کو خطاب لوٹانے کی دھمکی دیتا ہے۔

بلاشبہ ان گراں مایہ خطابات میں آج بھی تازہ وارادانِ بساط ہوائے دل کے لئے بے پناہ کشش موجود ہے لیکن خطابات کے لئے بار اول منتخب کئے جانے والے خطابات کے پس پردہ سیاسی بازیگری سے ناواقف ہوتے ہیں۔ حقائق سے واقف خطاب یافتہ پرانے شکاری یعنی گرگ باراں دیدہ کی آگہی ایک طرف اور خطابات کی کشش دوسری طرف عام کچھ یوں ہوتا ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

ہمیں نہ تو خطابات کی اہمیت سے انکار ہے نہ ہجو مقصود ہے نہ صاحبان خطاب کی کردار کشی سے کوئی علاقہ ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ خطابات، صاحبان خطاب کو موجب عزت و احترام بنا دیتے ہیں۔ خواہ وہ جملہ تقاریب کے دعوت نامے ہوں یا اخبار کی خبریں و مراسلے، اشتہارات ہوں یا خط و کتابت، مکان پر آویزاں تختیاں ہوں یا لوح تربت ان معنوں میں خطابات اپنے حامل کو موت کے بعد بھی زندہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ خطابات کے لئے نام کا اعلان ہوتے ہی مذکورہ شخصیت کا تصور ان کے سیاہ و سفید کارناموں کے ساتھ ذہن میں سما جاتا ہے مختلف عمر کے فنکاروں یا صاحب خطاب کی خدمات کے اعتراف اور خطابات کا اعلان اس قدر تاخیر سے ہوتا ہے کہ بعض فنکاروں کو خطاب قریب المرگ یا پس مرگ حاصل ہوتا ہے۔ کچھ حضرات وہیل چیئر پر عمر عزیز کا حاصل وصول کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ اس کمپرسی کی حالت میں دیکھ کر یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ حضرات کہیں شادیٔ مرگ میں آنجہانی نہ ہو جائیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی عاشق کی طرح شوق شہادت میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کوچۂ دلدار میں پہنچے ہوں۔

ایک خطاب تو ایسا بھی ہے جو آنجہانی صاحبان کے لئے ہی مخصوص ہے جیسے فوج کے بہادر افسران، میجر،

کرنل، سپاہی وغیرہ۔ چوں کہ جو قدر و منزلت شہداء کو میسر ہے وہ بھلا غازیوں کو کہاں میسر ہو سکتی ہیں چوں کہ مردہ پرستی ہماری تہذیب کا ایک امتیازی جزو ہے۔ بہرکیف خطابات میں وہ دائمی تاثیر ہے کہ وہ اپنے حامل کو پس مرگ بھی معاشرے میں زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔

بعض خطابات تو حسن محبوب کی طرح ایسے کرشمہ ساز ہوتے ہیں کہ چشم زدن میں صاحب خطاب کو باون گز کا بنا دیتے ہیں کیوں کہ مذکورہ خطابات موصوف کے نام، شخصیت، خاندان اور جملہ خصوصیات پر غالب ہو جاتے ہیں۔ خطابات کا حصول جہاں خطاب یافتہ حضرات کی توقیر و عظمت کا باعث ہے وہیں بسا اوقات تذلیل و زحمت کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ مثلاً گذشتہ دور کے اداکار شہنشاہِ جذبات کو جب پڑوسی ملک نے اپنے ملک کا باوقار خطاب عطا کیا تو ہمارے ملک کے مخصوص سیاسی طبقے نے عظمت کے اس نشان کو بے نشان کر دیا۔ لیکن جب اسی ملک نے ہمارے ایک سابق وزیر اعظم کو عظیم تر خطاب سے نوازا تو یہی طبقہ بغلیں بجا رہا تھا۔

اچانک دو دہے قبل سے دنیا کو نیا انکشاف ہوا ہے کہ ہندوستان میں بھی ملکۂ حسن پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا کہنے تھے ہر سطح پر ملکۂ حسن کی نمائش و مسابقت کا سلسلہ چل پڑا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ خطابات کی تقسیم بڑے بڑے تجارتی مقاصد کے حصول کا محرک بھی بن جاتی ہیں۔ مس بمبئی، مس بنگلور، مس دہلی، مس کلکتہ، مس جئے پور، مس کشمیر، مس انڈیا جیسی دوشیزائیں مس ایشیاء، مس ورلڈ اور مس یونیورس کے مقابلۂ حسن میں بھی شرکت کریں اور امریکہ کی تیار شدہ زنانہ اشیائے آرائش و زیبائش کا استعمال ان کے لئے ناگزیر ہو جائے۔ اس طرح امریکہ بھارت میں اپنے مصنوعات کا بازار گرم کر سکے۔ تمام تجارتی مفادات انہیں حقیر ہندوستانیوں کی کثیر آبادی سے حاصل ہوتے ہیں۔ کیا خوب دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔

کبھی کبھی انتہائی شاطر سیاست دانوں سے بھی خطا سرزد ہو جاتی ہے وہ بعض سرکردہ رہنماؤں کو خواہ وہ بقید حیات ہوں یا ملک عدم سدھار چکے ہوں انہیں فراموش کر دیتے ہیں۔ تب اس فرقے کی عوام اپنی ملی بیداری کا ثبوت دے کر جمہوری حقوق کا استعمال کرتے ہیں۔ منظم سیاسی تحریک، بھوک ہڑتال، راستہ روکو، زندہ باد، مردہ باد کے حربے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ اس طرح عوام اپنے رہنماؤں کو ان کا حق دلاتی ہے یوں حکومت بھی اپنے تجاہل عارفانہ کا اعتراف کر لیتی ہے۔

خطابات کا حصول نشہ ہے، سرور ہے لہٰذا اسے پانے کی ہوس اور دوڑ ہر زمانے میں اسی طرح یا اس سے زیادہ تیز رفتاری سے جاری رہے گی۔ آخر شہرت کسے پسند نہیں۔ ذرا خطابات کے انتخابات کا وقت تو قریب آنے دیجئے اور ملاحظہ کیجئے شہرت اور نام و نمود کے بھوکے امیدواروں کا حال اور ان کا اضطراب، خطابات کے حصول کا شوق دیکھ کر آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کہتا ہوں سچ کہ۔۔۔۔

چوری یوں تو معیوب اور قابل سزا جرم ہے اور بعض ممالک میں چوری کی سزا پر ہاتھ قلم کر دیئے جاتے ہیں۔ جو اس جرم کی سنگینی کا جواز ہے۔ مگر بعض شائستہ چوریاں جیسے آنکھوں سے کاجل چرانا، کسی معشوق کا دل چرانا، نظریں چرانا، کام سے جی چرانا، کرشن کنھیا کا مکھن چرانا جیسی معصوم واردات جو اکثر اوقات ناقابل مواخذہ سمجھی جاتی ہیں۔

دل چرانے کا عمل خاصہ دلبرانہ ہوتا ہے۔ جس میں دل چور اور صاحب دل یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ چوری کا گڑ میٹھا ہوتا ہے۔ چوری کا گڑ جتنا میٹھا ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی یادیں میٹھی ہوتی ہیں۔ یہ چوری دو طرفہ ہوتی ہے۔ اس حسین چوری میں دلوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور فریقین کے دل ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہو کر دھڑکتے ہیں جسے کہتے ہیں "دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی"۔ یہ حادثہ اتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ اس کا وقت اور مقام تاحیات دل سے محو نہیں ہوتا۔

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
ہم کو اب تک وہ پہر اور وہ ٹھکانہ یاد ہے

مقروض حضرات وعدہ خلافی یا شرمندگی و خجالت سے نظریں چرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کچھ ماہر و مشاق چوروں کو آنکھوں سے کاجل چرانے کے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ عموماً ایسے چور، چوری سے جاتے ہیں ہیرا پھیری سے نہیں جاتے ہیں۔ چوں کہ حالات ہمیشہ سازگار نہیں ہوتے اس لئے بعض اوقات ان چوروں کی قسمت کے ستارے بھی گردش میں آ جاتے ہیں۔ تو انہیں چور کے گھر مور مل جاتے ہیں یعنی نہلے پہ دہلا۔ یوں بھی یہ بات تو زبان زد خاص و عام ہے کہ چور کو چور پہچانتا ہے۔ مگر ثانی الذکر چور ڈھٹائی سے اپنی پارسائی کا بھرم رکھنے کے لئے چوری اور سینہ زوری کا آزمودہ حربہ اپنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مفت خورے اور کاہل حضرات اپنے پسندیدہ مشاغل سے شغل فرمانے کے لئے کام سے جی چراتے ہیں۔

چوری کی مزید کچھ اقسام کو مباح اور ناقابل گرفت تصور کیا جاتا ہے جیسے ایک مشہور مقولہ ہے "کتاب کی چوری جائز ہے"۔ اس کے پس پشت نیت، اخلاص عمل کا دخل ممکن ہے یعنی یہ عمل علم کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ فی زمانہ کتابیں چرانے کا جرم معمولی اور قابل عفو ہے۔ اصل فنکاری کتابوں سے اقتباسات کی چوری اور ان کی ملکیت کا خود ساختہ مجاز ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف فن بلکہ "ادبی صنعت" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ پہلے پہل چوری چوری تخلیقات کا سرقہ، چربہ، استفادہ جیسے اعمال سے ان فن پاروں کے تخلیق کاروں کو کوفت ہوتی تھی۔ اس کوفت سے نجات پانے کی سہل

ترکیب یوں تلاش کی گئی کہ تخلیق کاروں نے اپنے ہی فن کو بازار میں بے نام (بغیر اپنے نام کے) فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔ شاعروں نے متشاعر پیدا کر دیئے۔ انشاء پردازوں نے ماضی کے اساتذہ کی مشہور تخلیقات کے چربے، افسانوں کے پلاٹ، تکنیک اور نقطۂ عروج میں کچھ خاطر خواہ تبدیلیاں کر کے نام نہاد ادباء کے ہاتھوں فروخت کر دیں۔ اس عمل کا محرک یہ ہے کہ نانِ شبینہ چرانے سے بہتر ہے اپنے اکتسابی عمل کی صحت مند قیمت وصول کی جائے۔ اسٹیج پر چہکنے اور رسائل میں چھپنے والے ایسے متشاعر اور معنویت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ادیب پس پشت ذلت آمیز فقروں سے نوازے جاتے ہیں۔

متشاعروں کا شیوہ ہے دیس چوری پر دیش بھیک، بلاخوف وخطر وہ منتظمین مشاعرہ، شعرائے کرام اور سامعین کی آنکھوں میں جوتا پہن کر گھس جاتے ہیں۔ مشاعروں میں پیشہ ورانہ انداز پیش کش اور ترنم کے ساتھ اس انداز سے سناتے ہیں کہ فطری شاعروں کو بھی ان پر رشک آجاتا ہے۔ جب سامعین بھی فراخ دلی سے لہک لہک کر انہیں داد و تحسین کے ساتھ نذرانوں سے نوازتے ہیں تو متشاعر چہک چہک کر طرفہ تماشہ پیش کرتے ہیں تو شعری تخلیقات فروش شعراء ابرو کے اشارے سے اپنے مصاحبوں کو کلام کی کامیابی کی حقیقت شاعرانہ بلکہ مجبوبانہ انداز میں واضح کر دیتے ہیں گویا چور سے کہیں چوری کر شاہ سے کہیں تیرا مال لٹا۔ ادھر متشاعر بھی طویل عرصے تک شاعر نہیں تسلیم کیا جاتا چوں کہ ضرب المثل مشہور ہے چور کی داڑھی میں تنکا۔

ایک مخصوص عرصے تک تو متشاعر حضرات کو اپنے تخلیق فروش شاعر پر اعتبار ہوتا ہے کہ وہ ہر مرتبہ حاصل محفل کلام ہی انہیں عطا فرماتے ہیں تاوقتیکہ رقم کی ادائیگی میں دیانتداری برتی جاتی ہے۔ تب تک مشاعرہ لوٹنے والے حاصل مشاعرہ کلام میسر ہوتے ہیں۔ مٹھی بند ہو تو لاکھ کی ہوتی ہے یعنی گھر کی بات گھر میں رہ جاتی ہے اس طرح متشاعر کا بھرم بطور شاعر قائم رہتا ہے مگر جوں ہی رقم کی ادائیگی میں تقصیر (کاٹ کسر) یا کلام کی غیر مقبولیت حائل ہوتی ہے وہاں متاسف تخلیق کار شاعر یہ راز آشکارا کرنے سے باز نہیں رہتا کہ تخلیقات کا اصل خالق کون ہے۔ آخر تخلیق سے محبت فنکار کا وہ فطری جذبہ ہے جو تخلیق کی فروختگی کے بعد بھی تخلیق کار کے دل میں دوگنی شرح سے قائم رہتا ہے۔ جیسے بیٹیاں بیاہ دینے سے والدین کی محبت ان سے دو چند ہو جاتی ہے۔ مگر متشاعر حضرات سامعین کی داد کے نشے میں غالباً یہ بھول جاتے ہیں کہ ہنستے ٹھاکر اور کھانستے چور، ان دنوں کا آیا اور جب محفل سخن سے ناکام و نامراد لوٹتے ہیں تو متشاعروں کو شدید احساس ہوتا ہے کہ جیب بھی ہلکی ہوئی اور مزہ بھی نہ آیا۔ گویا اپنا ہی مال جائے، آپ ہی چور کہلائے۔ تو ان کی انا پر زبردست چوٹ پہنچتی ہے۔ الٹا چور ڈانٹے کوتوال کو، کے مصداق وہ تخلیق کار شعراء سے رقم لوٹانے کی بحث چھیڑ دیتے ہیں مگر متشاعر حضرات اپنے شعار سے قطعاً باز نہیں آتے۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔

چمچماتے چمچے

چمچوں کی اہمیت وافادیت ان کے بے حد کارآمد ہونے کی پختہ دلیل ہیں۔ چمچے یوں تو دال بگھارنے، سالن بگھارنے، باتیں بگھارنے، شیخی بگھارنے اور سیاست بگھارنے جیسے اہم افعال میں بڑے معاون ومددگار ہوتے ہیں۔ چمچوں کی عدم موجودگی میں آپ کی نرم ونازک انگلیوں کو گرم پتیلی میں غوطہ زن ہونا پڑے گا۔ اسی طرح جیتے جاگتے فعال چمچوں کے بغیر اعلیٰ حکام تک رسائی کے لئے دفاتر کے چکر، رشوت اور بالآخر ذلت وخواری کی راہ پر گامزن ہونا پڑے گا۔ جس طرح قسم اول کے چمچے امور خانہ داری سے متعلق ہوتے ہیں ان کے بغیر پکوان یعنی باورچی خانے کی شان ناممکن ہے اسی طرح چمچوں کی قسم دوم یعنی وہ چمچے جو سانس لیتے ہیں ان کی اعانت کے بغیر دوکان سیاست چمک نہیں سکتی۔ خانہ داری کے چمچے بسااوقات پتیلی سے زیادہ گرم ہوجاتے ہیں لیکن انہی چمچوں کی مدد سے پکوان کا ذائقہ معلوم ہوتا ہے۔ بازار سیاست میں دو پیروں پر چلنے والے چمچے ہمہ وقت سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان چمچوں سے آپ پکوان کا ذائقہ تو معلوم نہیں کرسکتے البتہ ان کی کثیر تعداد سے ارباب سیاست کی مقبولیت اور قدرومنزلت کا پتہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا ہر کوئی۔

خانہ داری کے چمچے اپنے استعمال سے اعتبار سے مختلف انواع کے ہوتے ہیں جیسے چھوٹے، بڑے، گول، چپٹے، سیدھے، ٹیڑھے، سپاٹ اور جالی دار۔ عین اسی طرح سیاست کی دیگ کے چمچے بھی کچھ بنیادی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں مثلاً خوشامد، فارغ الاوقات، چاپلوسی اور مدح سرائی وغیرہ۔ یہی اوصاف ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ چمچے اپنے استعمال کے بعد دھل کر صاف ستھرے ہوجاتے ہیں لیکن سیاسی چمچوں اور غلاظت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ سیاست اور غلاظت دور حالیہ میں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ غذا اگر سیال یا نیم سیال ہو تو نوش کرنے میں چمچے معاون ہوتے ہیں ورنہ دیگر غذائیں تو ہم ہاتھ سے بھی کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض پیچیدہ کاموں کی تکمیل صرف ان چمچوں کی معاونت سے ہوتی ہے جن کے بغیر یہ کام ناممکن ہوجاتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر شباب للت ؎

خلوتیں بدنام ان چمچوں سے ہیں
جلوتیں خوش کام ان چمچوں سے ہیں

ان چمچوں کا طرفہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جامہ شرافت میں رہتے ہیں۔ نہ بغاوت کرکے پتیلی کی ہمسری کے لئے طرف کوشاں ہوتے ہیں نہ ہی متبادل ہی کہلانے کے دعویدار۔ مگر بالخصوص انسانی چمچے جنہیں مہذب زبان میں مصاحب

کہتے ہیں "م" سے نجات پا کر "صاحب" بننے کے لئے انتہائی سنگین واردات بھی کر گذرتے ہیں۔ چوں کہ مصاحبین نہ صرف صاحب کے راہبر، راہزن، مشیر، رازدار اور جاسوسی کی حد تک خبر رساں ہوتے ہیں بلکہ انہیں صاحب کا سفینۂ سیاست پار لگا دینے کی بھی اہلیت حاصل ہوتی ہے اور لٹیا ڈبو دینے کی بھی۔ صاحب کو تخت پر بٹھانے، تختہ پلٹنے اور تختہ دار پر لٹکانے جیسے کاموں میں یکساں طور پر معاون ہوتے ہیں۔ ہمارے ہمسائے ملک میں اس قسم کے واقعات اکثر و بیشتر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ہمارے ہاں بھی۔ جن کا جواز یہ ہے کہ میدانِ سیاست میں کوئی کسی نہ تو مستقل طرف دار ہوتا ہے نہ تابعدار۔

بقول ڈاکٹر شباب للت

لذت کام و دہن چمچوں سے ہے
رونق ہر انجمن چمچوں سے ہے
کوئی ہنگامہ ہو کوئی بزم ہو
یہ چمکتے رہیں تو خوب ہے
یہ کھنکتے رہیں تو خوب ہے

بیل کو پروان چڑھنے کے لئے درخت یا دیگر کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح چمچے صاحب کے کاندھوں پر سر پر چڑھ جاتے ہیں جس طرح بیل اس سہارے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح مصاحبین بھی صاحب کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب یہ بات صاحب کی ذہنی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ بیل کا جائزہ لے لے کہ کہیں وہ امر بیل کے حصار میں تو نہیں ہے۔ اگر صاحب نے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر جنم لیا ہے تو وہ اقتدار و سیاست کی مئے دو آتشہ کے نشے میں اس اندیشے سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ بصورت دیگر بساط الٹتے ہی چڑھتے سورج کے پجاری چمچے اگلے صاحب اقتدار کے در کا رخ کر لیتے ہیں۔ جب برے وقت میں سایہ ہی ساتھ چھوڑ جاتا ہے تو ان چمچوں پر کیسا الزام؟ یہ بے چارے کس شمار و قطار میں ہیں؟

بات بنتی ہی نہیں ان کے بغیر
بزم سجتی ہی نہیں ان کے بغیر
رونق محفل انہیں چمچوں سے ہے
دوستوں اسٹیل کے چمچے یہ نہیں
خیر سے چاندی کے یہ ترشول ہیں

مصاحب ہونا کوئی معیوب بات نہیں، باعث شرمندگی یا خجالت بھی نہیں۔ غالباً اسی لئے مرزا غالب نے علی الاعلان بقلم خود اپنے مصاحب بن کر اتراتے پھرنے کا اعتراف کیا ہے "بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا"۔ اس

کے بیش بہا فوائد بھی ہوتے ہیں اول یہ کہ مصاحب طفیلی کردار کا حامل ہوتا ہے جس کی جیب ناتواں کسی بھی خرچ کی ضرب سے محفوظ ہوتی ہے۔ لہٰذا مصاحبین کے شاہانہ اخراجات، عیش وعشرت، دعوت وضیافت، سیر وتفریح کا بار صاحب کی جیب پر ہوتا ہے۔ انہیں VIP ٹریٹمنٹ، اعلیٰ وارفع افراد سے مراسم، اعلیٰ حکام تک رسائی، مفت کے خورد ونوش، آؤ بھگت، سماج میں شناخت ومقام اور سرکاری ودرباری کاموں میں آسانیاں جیسے غیر مادی فوائد بھی میسر آتے ہیں۔

بقول شاعر

زر، زمین و زن، غرض ہر چیز نذرانے میں
ہر طرح کا فائدہ اک چچہ بن جانے میں

راقم کو چچوں سے کوئی بیر نہیں ہے۔ فقط اتنا عرض ہے کہ چچوں کی خدمات محض گرم پتیلیوں میں سیر وتفریح کر کے نہ صرف مسالہ جات کو ملانا، بھونا ذائقہ چکھنے تک محدود نہیں ہے بلکہ پکوان کو پتیلی تا طشت، طشت تا دہن سفر کروانا بھی ہے انہی کی طرح مصاحبین کا فرض ہے کہ وہ صاحب کی پذیرائی اور مدح سرائی اس طرح کریں کہ وہ سیاسی تخت پر جلوہ افروز ہو کر کسی منصب پر فائز ہو سکے ورنہ ان کا کردار یہی ہوتا ہے۔ حال کا نہ قال کا روٹی چچہ دال کا

ہوئے جی کے ہم جو رسوا

آپ نے اکثر مختلف رفاہی ادارے مثلاً انجمن حقوق نسواں، انجمن تحفظ اطفال، انجمن تحفظ برائے حواش طیور، ادارہ برائے تحفظ وحشی چرند، پرند ودرند اور ادارہ انسانی ذرائع وسائل وغیرہ کے نام تو ضرور سنے ہوں گے جو عموماً عورتوں، بچوں، پالتو اور وحشی جانوروں کے تحفظ اور عدم استحصال کے لئے قائم کئے جاتے ہیں مگر نہ مردوں بالخصوص شوہروں کو قابل توجہ سمجھا جاتا ہے جبکہ شوہروں کو بیویوں کے ناروا سلوک اور کج روی کا آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج معاشرے میں جا بجا شوہروں پر ظلم وستم مسلسل ومتواتر ڈنکے کی چوٹ پر ڈھائے جاتے ہیں۔ شوہروں پر بیویوں کا اتنا خوف مسلط ہے کہ انہیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ادارے کی تشکیل کی ہمت بھی نہیں ہوتی ہے جہاں وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے احتجاج کرسکیں یا پھر ایک دوسرے کی داستان ستم اور غم سن کر دل ہلکا کرسکیں۔

ایک شوہر ستم ہائے روزگار سے فارغ ہو کر خواہ ملازمت ہو تجارت یا اس قسم کی دوسری مصروفیت جب اپنے دارالامان (جو درحقیقت دار المصائب ہوتا ہے) کا رخ کرتا ہے۔ ابھی دماغ ہزاروں قسم کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے الجھا ہوا ہوتا ہے سوچتا ہے چند گھڑی چین کی سانس لے تو بیوی وہاں پہلے سے بھری بیٹھی ہوتی ہے۔ اول تو سودا سلف کی کمی کا رونا، باورچی خانے میں درپیش مشکلات کی شکایت، سودا سلف میں نقص اور شوہر کی بہنوں بھابھیوں اور والدہ کی فتنہ پردازیوں کے گلے سننے پڑ جاتے ہیں۔ ابھی شوہر کا دماغ ان موضوعات کی نزاکت پر کسی مناسب حل کا متلاشی ہی ہوتا ہے کہ بچوں کی شرارت اور ان کے قصے بھی گوارا کرنے پڑتے ہیں۔ بعض شوہر جو جذباتی ہوتے ہیں فوراً بپھر کر منفی رد عمل ظاہر کردیتے ہیں۔ اگر زن مرید ہوئے تو فوراً اپنی بہنوں بھابھیوں اور والدہ سے باز پرس کرکے اچھا خاصہ جھگڑا کر لیتے ہیں۔ یعنی گھر چند ہی لمحوں میں پانی پت کا میدان معلوم ہونے لگتا ہے یا پھر کبھی ہمت کرکے بیوی کو ہی ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بیوی اپنی شکست پر چراغ پا یہ دیکھتی ہے کہ ''الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا'' تو بیوی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی ہے۔ قسمت کو کوسنے لگتی ہے۔ اپنے بھائیوں اور والدین کو لعنت ملامت کرتی ہے کہ نہ جانے کیسے آدمی کے پلے باندھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ بس شوہر کا غصہ اسی بات پر تحلیل ہوجاتا ہے اور وہ خوامخواہ طیش میں آنے پر کف افسوس ملنے لگتا ہے۔ طیش میں آنے پر کف افسوس ملنے لگتا ہے۔ پھر وہ بیگم صاحبہ کو منانے بیٹھ جاتا ہے تو موصوفہ ناز وادا سے اسے مزید روٹھ جاتی ہیں۔ اب شوہر غم دوراں کی مار جھیلے یا غم جاناں کی؟ جو ٹھہرے چکی کے دوپاٹ۔ اگرچہ میاں بیوی علیحدہ رہتے ہوں جہاں بیوی کو دیگر سسرالی رشتے داروں سے نجات تو مل جاتی ہے مگر بے چارے شوہر کو کہاں قرار۔ بچوں کی شرارتوں کا گلہ، پانی کی قلت کا گلہ، خادمہ کے ناغے اور لاپرواہیاں، کام کی

زیادتی کارونا، ناقدری پر رنجش، دکھ و بیماری میں آہ و فغاں (جو اکثر متوجہ کرنے کی سبیل ہوتی ہے) یا پھر تصرفات کے لئے موٹی رقوم کے مطالبات مثلاً بجلی، ٹیلی فون، اخبار، دودھ، کرانہ، بچوں کی فیس، شادیوں میں قیمتی تحفے تحائف کے بل، کس کس بات کا رونا روئے اور کس کے سامنے روئے۔ عقلمند شوہر خاموشی اور صبر سے پوری روداد سن لیتا ہے۔ فوراً کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتا۔ مگر بعض شوہر بڑے بے جگرے ہوتے ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں تاکہ جذباتی ہیجان یا بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ کچھ لوگ بیویوں کی کامنٹری کے بعد برموقع برمحل نہ صرف مناسب حل تجویز کرتے ہیں بلکہ ان کو روبہ لانے میں بیوی کی عملاً مدد بھی کرتے ہیں جس پر ان کو اپنی والدہ ایک مخصوص اصلاح سے یاد کرتی ہیں یعنی "جورو کا غلام"۔ بقول مومنؔ

نہ جائے واں بنی ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل بھی طرح

اکثر بیویوں کو اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے پکوانوں کی تعریف سننے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے۔ جونہی شوہر پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے دسترخوان پر بیٹھتا ہے بیوی اشارے کنائے اور آڑے ترچھے سوالات کر کے جواباً پکوان کی تعریف سننے کی خواہاں ہوتی ہے یا شوہر سے مجبوراً تعریف اگلوا لیتی ہے۔ ایسے شوہر جو بیوی کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں صرف پکوانوں کی خوشبو کی تعریف کر کے ہی موصوفہ کا دل موہ لیتے ہیں۔ ان کے برعکس کچھ لاپرواہ بے حس و بے نیاز قسم کے شوہر بس "دست خود دہان خود" کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں تو انہیں کھانے کے ساتھ طعنے بھی سننا پڑتے ہیں۔ جن شوہروں کو اپنی بیویوں کی کمزوری کا علم یا علم نفسیات کے حربوں سے واقفیت ہوتی ہے وہ بات سے بات پیدا کر کے بیوی کی تعریف کرتے کرتے موصوفہ کو ہی مذاق کا موضوع بنا دیتے ہیں۔ اکثر شوہر سیدھے مزاج و خاموش طبع ہو تو بیوی لذت دار پکوان کے ساتھ فرمائش کی فہرست، خریداری اور سیر سپاٹے کا پروگرام بھی دسترخوان پر شوہر کے گوش گذار کر دیتی ہے جو بعض اوقات شوہر کا ہاضمہ خراب کر دیتے ہیں۔

بعد از طعام شوہر نیم آرام کیفیت میں غم جاناں اور غم دوراں سے فرار حاصل کرنے کی خاطر اخبار بینی میں غرق ہونے میں کوشاں ہوتا ہے تو بیوی بجائے پنکھا جھلنے کے بے معنی باتیں کر کے شوہر کی ذہنی یکسوئی کی دشمن بن جاتی ہے۔ مظلوم شوہر بیوی کے عتاب کے خوف سے "ہوں ہوں" کر کے ٹالتا جاتا ہے۔ بعض اوقات خبروں کی دلچسپی، گہرائی و گیرائی سے متاثر ہو کر شوہر با آواز بلند بیوی کو خبریں سناتا ہے۔ ادھر وہ نازنین بے اعتنائی سے کلائی میں کنگنوں سے کھیلتی ہے۔ بقول حسرتؔ

بے رخی کے ساتھ سننا دردِ دل کی داستاں
وہ کلائی میں ترا کنگن گھمانا یاد ہے

چونکہ شوہر کے ذریعے سنائی گئی خبروں سے بیوی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جب شوہر نگاہیں اٹھا کر بیوی کے

چہرے کے تاثرات پڑھتا ہے تو گویا چہرہ کورا کاغذ معلوم ہوتا ہے۔ بیوی کو شوہر کی توجہ (زن مریدی) سے سروکار ہوتا ہے گویا۔

ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یعنی یہی وہ داخلی معاملات ہیں جہاں ہمیشہ شوہر کا استحصال ہوتا ہے۔

اگر کسی تقریب، شادی یا دعوت کے لئے اہل خانہ کو جانا ہوتا ہے تو شوہر نامدار کے ذمے نہ صرف خود تیار ہونے کی ذمہ داری ہوتی ہے بلکہ بچوں کی تیاری بھی شوہر کے سر منڈھ کر بیوی خود آئینہ کے سامنے سو سو زاویہ تبدیل کر کے خود کلامیاں، خود ستائش اور تنقیدی جائزہ لینے میں وقت کا زیاں کرتی ہے پھر ناز و ادا سے ایک نغمے کی گنگناہٹ کے ساتھ ملمع کاری (میک اپ) کے جملہ مراحل سے گذرتی ہے جس کے لئے وقت کی کوئی حد فاصل مانع نہیں ہوتی ہے۔ اسی دوران شوہر اور بچے سج دھج کر اپنی سواری (موٹر سائیکل) پر سوار ہو کر محترمہ کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ خصوصاً شوہر بڑی بردباری، کمالِ بے صبری سے انتظار کا لحہ لحہ گذارتا ہے جوں ہی محترمہ تشریف لاتی ہیں عقلمند اور موقع شناس شوہر ایک دو مکالمے بیوی کی حسن زیبائش کے قصیدے ادا کر کے بیوی کو بے دام غلام بنا لیتے ہیں اور جب کہ سادہ لوح شاہر عجلت کا مظاہرہ کر کے بیوی کی شان میں تعریفی کلمات ادا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں تو راستہ بھر بیوی سے اپنی بے اعتنائی اور بے حسی کا طعنہ سنتے ہیں خیر خدا خدا کر کے سفر کٹتا ہے اور قافلہ منزل مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔

محفل میں بیوی تو اپنی سہیلیوں، عزیز رشتہ داروں میں گھل مل جاتی ہے۔ وہاں سونے کے زیورات مہنگے اور کم یاب لباس، میک اپ اور سینڈل پر حاضرین سے داد و تحسین حاصل کرتی ہے۔ ادھر شوہر کی دائیں کہنی ہمیشہ زاویہ قائمہ کی شکل میں ہوتی ہے تاکہ بچہ گود میں بیٹھ سکے۔ لوگ بچوں کی عمر اور تعداد پوچھ کر بیوی کی سن بلوغت اور زن مریدی کے پیمانے مرتب کر لیتے ہیں۔ محفل میں وہی بیوی اپنے ستم زدہ شوہر کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی ہے۔ اپنی سہیلیوں میں مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتی ہے کہ شوہر اس کی بہت قدر کرتا ہے۔ سسرال والے اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ان ساری کوششوں میں تعریف و حسنات کا محور بیوی کی اپنی ذات ہوتی ہے ایک بیوی کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ میرے میاں تو سورج مکھی کا پھول ہیں جہاں میں ہوتی ہوں وہیں دیکھتے ہیں لہٰذا خود نمائی و خود پرستی کا جذبہ خوش فہمی سے تجاوز کر کے غلط فہمیوں کی حدود سے جا ملتا ہے۔

اگر شوہر تقریب میں شامل شناسا دوستوں سے بے تکلفانہ یار باشی کرتا ہے تو بیوی کو شوہر کی یہ آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ فوراً اپنے جگر پاروں کو شوہر کے حوالے کر کے بڑے مزے سے ساری محفل میں لہراتی بل کھاتی اور اٹھلاتی پھرتی ہے۔ شوہر بیچارہ کیا کرے فرمانبرداری اور سعادت مندی سے بچوں کی نگرانی پر معمور ہو جاتا ہے گویا کوئی تربیت یافتہ گورنس اپنے فرائض انجام دے رہی ہو اور اگر کوئی بزرگ خاتون یا سہیلی بیوی سے بچوں کے تعلق سے دریافت کرے تو بڑی سادگی سے گویا ہوتی ہے۔ میرا بیٹا تو اپنے ابو کی گود میں ہے اور شان بے نیازی سے آگے بڑھ جاتی

ہے۔

اگر میاں بیوی کو مشترکہ طور پر بازار میں سودا سلف یا کپڑے خریدنے کی ضرورت پیش آجائے تو بیوی جملہ اشیاء کے رنگ ڈیزائن اور ساخت کے مباحثے میں پیش پیش رہتی ہے۔ شوہر بیچارہ لخت جگر کو گود میں اٹھائے ہوئے ہوں ہوں کی گردان الاپتا رہتا ہے۔ احمق بنتا ہے کنگال ہوتا ہے اور رہی سہی عزت کے تحفظ کی خاطر بیوی کی ہر پسند پر آمنا صدقنا کہتا ہے۔ وگرنہ کہیں ہنگامے اور روٹھنے منانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے بیوی خریداری کے وقت خاصی پر جوش اور بااعتماد نظر آتی ہے۔ سہیلیوں کی حرص اور امثال کا برموقع برمحل تذکرہ چھیڑتی ہے۔ شوہر کاٹھ کا الو یا کٹھ پتلی کی طرح بیوی کی پیروی کرتا پھرتا ہے اور اپنی بچی کچھی ساکھ بچانے کی خاطر جورو کا غلام بنا پھرتا ہے۔ اگر بچے تھوڑے بڑے ہوں تو وہ بازاروں میں بے تحاشہ دوڑتے پھرتے ہیں شوہر ان کے پیچھے ہلکان ہو کر عہد طفلی یاد کرتا ہے اور اکثر اپنے مشن میں ناکام ہو کر بیوی کے طعنوں کا شکار بن جاتا ہے۔

منشی پریم چند نے بیوی کی نفسیات پر فقرہ چست کیا تھا "عورت ہزار غم برداشت کر لیتی ہے میکے کی برائی نہیں برداشت کر سکتی"۔ بالفرض شوہر نے غلطی سے ہی اپنی سسرال سے متعلق کوئی شکایت آمیز بات کہہ دی ہو تو بیوی اپنی سسرال کے نسل در نسل مردوں کو القابات سے نوازنے سے باز نہیں رہتی۔ اس کے برعکس جہاں شوہر نے اپنی سسرال کی تعریف کی بیوی پھولے نہیں سماتی ہے اور اپنے خاندان کے ایسے قصیدے کہنے شروع کر دیتی ہے کہ شوہر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں اس غلطی کے اعادے سے توبہ کر لیتا ہے۔ اگر شوہر شوخ مزاج ہو اور اپنی سسرال سے متعلق اظہار خیال کرنا ہی چاہے تو اسے چاہئے کہ اپنے برادران نسبتی کی تعداد و جسامت کے ساتھ متوقع زخموں کا پیشگی تخمینہ ضرور کر لے یا کم از کم بیوی کے عتاب کا منتظر رہے

بعض شوہر حد درجہ محتاط ہوتے ہیں جو بیوی کو غیر ضروری طعن و تشنیع کا موقع فراہم نہیں کرتے مگر بیوی کی دسترس میں اس کے اپنے بچے ہوتے ہیں جن پر نزلہ گرا کر وہ معصوم بچوں کو ان کی خاندانی خصلتوں کے حوالے سے ایسے ایسے القاب سے نوازتی ہے گویا بچے ان دقیق طعنوں کا مفہوم سمجھتے ہوں دراصل اصل تختہ مشق تو شہر کی ذات ہوتی ہے اگر اس کی خاندانی حمیت اور انا بروقت بیدار ہو جاتی ہے تو وہیں پانی پت کا میدان وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اگر شوہر نے تدبر تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کیا اور بیوی کو ٹیڑھی پسلی جان کر نظر انداز کر دیا تو بیوی بھڑاس نکال لیتی ہے اور دل بھر کے شوہر کی دلآزاری بھی کر لیتی ہے۔ گویا "کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ" شوہر اس طرح ہنگامی و غیر متوقع خانہ جنگی کو ٹال دیتا ہے۔ عزت بھی محفوظ رہ جاتی ہے اور پھر تعلقات میں کشیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی ہے مگر اس معراج کو پہنچنے کے لئے خاصی مشق اور تجربہ درکار ہے۔ اگر تجربہ زیادہ ہو جائے تو پھر شوہر جسارت کے لائق نہیں رہ جاتا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اگر اللہ تعالیٰ شوہروں کو یہ سعادت ودیعت فرمائے کہ تم بیوی کی خوشنودی کی خاطر ایک مرتبہ مر کر پھر زندہ ہو سکتے ہوں تو شوہر حضرات فوراً ایسا کر گذریں گے لیکن پھر بھی بیوی یہی کہے گی، ''اونہہ اس میں کمال کی کیا بات ہے؟'' تو شوہر کو یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی نہ تو اس کی شکرگذار ہوگی نہ اپنے حسن پر قربان جانے والے کی قدرداں۔ شوہر تا عمر بیوی کو مرغ مسلم کھلا کر بھی بیوی کے میکے کی دال کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا تعریف سننے کی کوشش بے سود ثابت ہوگی مگر پھر بھی شوہر بساط بھر کاوش میں اچھے خاصے اخراجات کے بعد بھی مایوسی کو گلے لگا لیتے ہیں۔

اگر معاملہ اس کے برخلاف ہو کہ آپ بیوی کی مدح سرائی اور حسن کی تعریف کرتے رہیں تو آپ کے لئے نت نئے پکوان خصوصی توجہ خاطر مدارت کے ساتھ ساتھ موٹے جیب خرچ کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بیویاں جو برسرروزگار (صاحب مال وزر) وصاحب حیثیت ہوتی ہیں ان کے نکمے شوہر ایسے عجیب وغریب حربے بروئے کار لا کر نہ صرف بیوی کی کمائی پر پلتے ہیں بلکہ اچھے خاصے بلند معیار زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ بیوی اپنی سہیلیوں میں اپنے شوہر میں غلامانہ کیفیت پیدا کر کے ممتاز ہو جاتی ہے اور سعادت مندی کو اپنی مردانہ بالادستی بالائے طاق رکھ کر ہمہ وقت بیوی کی رضامندی اور سعادت مندی کا نیاز مند ہونا پڑتا ہے۔ شوہر کی اصطلاح میں ''مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے'' اور ہندی اصطلاح میں ''زن جم سدا سکھی'' کہلاتا ہے۔

بیوی شوہر کی بالادستی وقتی طور پر طوعاً و کرہاً گوارا کر لیتی ہے مگر شوہر سے اپنی خدمات کے اعتراف اور تعریف کا خراج برابر اوصول کرتی رہتی ہے۔ شوہر کو اپنی ضد، انا اور ہٹ دھرمی کے دھرم سنکٹ میں الجھا کر رکھتی ہے گویا شوہر لٹو ہو اور بیوی کی خوشنودی اس لٹو کا محور۔ مشہور مقولہ ہے کہ ''جو ساری دنیا کے تمام محاذ فتح کر لیتا ہے اپنے گھر کے محاذ میں ضرور شکست سے دو چار ہوتا ہے'' مگر دلیر شوہر اپنی خفت مٹانے اور دوستوں میں اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے فرضی قصے سنا کر دوستوں کو مرعوب کرنے کی ناکام سی کوشش کرتے ہیں جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ''میں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟''

شوہروں کو اگرچہ بیویوں کے ناز و ادا اور فرمانبرداریوں سے شکوہ ضرور ہوتا ہے مگر دل کے غبار کے اخراج کی کوئی معقول سبیل نظر نہیں آتی۔ بڑے صبر وضبط کا مقام ہے بغاوت کر بھی دے تو آزادانہ اظہار خیال کے بعد القابات یہی ملیں گے ''زن مرید'' یا ''جورو کا غلام'' لہٰذا ان القابات کے خوف سے خاموش شوہر شمع کی طرح پگھلتا جاتا ہے۔

ہونٹوں کے پاس آئے ہنسی کیا مجال ہے
دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں

شوہروں کے مستقل استحصال، تنزلی، ابتر حالت اور منتظر فردا کے رویئے سے متاثر ہو کر ہم نے ایک انجمن کی تجویز پیش کرتے ہیں جہاں رنجیدہ، ستم زدہ، زخم خوردہ شوہر نہ صرف جلے دل کے پھپھولے پھوڑیں۔ ایک دوسرے کا غم

ہلکا کر سکیں بلکہ اتحاد و اتفاق سے شجر ممنوعہ کے گندم کھانے پر اکسانے کا انتقام لینے کی کوئی حکمت عملی بھی ترتیب دے سکیں اور پامال شدہ حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ جمہوریت میں ان مظلوموں کا بھی حق دیا جانا چاہئے۔

اگر اس قبیل کے شوہروں کو درج بالا تجویزات پسند آجائیں تو وہ مجوزہ انجمن کا رکن بننے کی زحمت گوارا فرمائیں اور متفقہ طور پر صدر انجمن کا انتخاب بھی عمل میں آجائے۔ یوں تو ؎

قابل صد احترام قدر کے لائق ہیں آپ
شوہروں کی انجمن کے صدر کے لائق ہیں آپ

ہم نے بساط بھر چراغ جلا کر راہیں روشن کر دی ہیں۔ بقیہ مرحلہ آپ کے ذمے سونپتا ہوں کہ بالآخر ہم بھی ایک مظلوم شوہر ہیں اور ہمیں بھی باعافیت گھر لوٹنے کی فکر ہے۔ ابھی ہم کشتیاں جلانے کا حوصلہ مجتمع نہیں کر سکے ہیں۔

گالیاں کھاکے۔۔۔۔

معاشرے میں جب کبھی اخلاقی اقدار انحطاط پذیر ہوتی ہیں تو طرح طرح کی سماجی برائیوں کے ساتھ دولت دشنام (گالی گلوچ کے خزانے) کا پیمانہ بھی چھلک اٹھتا ہے۔ ہر خاص و عام کے لبوں پر دشنام طرازیاں حقارت آمیز فقرے اور اہانت آمیز کلمات کی بہتات ہو جاتی ہے۔ یوں بھی دولت دشنام سدا لازوال ہے۔ نہ کساد بازاری کا خطرہ نہ خسارے کا خوف۔ آپ جسے جتنا لوگوں میں تقسیم کریں گے اس کے کئی گنا اضافی صورت میں وہ آپ کو بلا معاوضہ فوراً لوٹا دیں گے تاکہ احسان یا طبع نازک پر بار نہ رہے لہٰذا اس دولت کی تقسیم میں نقصان کا اندیشہ مطلق نہیں رہتا۔ ہر صورت منافع کی آمد یقینی ہو جاتی ہے۔ دشنام طرازی شیطان کا سہل ترین آلۂ کار ہے۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کے غصے کو نقطۂ اشتعال سے نقطۂ انجماد تک لانے میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ دشنام طرازی کے بعد فاعل کو ایک طرح کا سکون مل جاتا ہے اور غصہ جاتا رہتا ہے جہاں انسان کی انا کو چوٹ پہنچتی ہے یا شخص کی عظمتوں کو رد کیا جاتا ہے جہاں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا مقصود ہوتا ہے جہاں اپنے رعب داب قائم رکھتے ہوئے ماتحتوں پر نزلہ گرانا ہو تو دشنام طرازی کو نہ شعوری کاوش کی ضرورت ہوتی ہے نہ پیشگی سوچ بچار یا منصوبہ بندی کی۔ یہ عمل از خود سرزد ہو جاتا ہے اور دشنام طراز کو گو اطمینان میسر آجاتا ہے۔ دل کا غبار رخصت ہو جاتا ہے۔ انتقام لے لینے کی تسکین ملتی ہے ان معنوں میں وہ ایک نفسیاتی دباؤ سے آزاد ہو جاتا ہے ہر چند کہ دشنام طرازی ایک قبیح ترین فعل ہے۔ جو مہذب معاشرے میں معیوب تصور کیا جاتا ہے۔

دشنام کی ہر نت نئی تراکیب، اصطلاحات، تشبیہات و استعارے پیدا کرنے کے لئے نہ دانشوروں کی گرانقدر خدمات درکار ہوتی ہیں نہ مخصوص اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کے قیام عمل میں لانے کی۔ نہ شرح و فرہنگ درکار ہیں نہ تحقیق کے لئے تجربہ گاہ کی ضرورت ہے نہ سائنسی آلات نہ کیمیائی تراکیب کی الجھن۔ نہ تحقیقی تنقیدی تجزیاتی و تقابلی مطالعے کی حاجت ہی ہے۔ یہ خودرو پودے کی طرح پھوٹتی ہے اور آناً فاناً شاخ دار و ثمر آور تناور درخت بن جاتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جتنے اصطلاحی تجرباتی و ترکیبی اضافے دشنام طرازی کے میدان میں عمل میں آتے ہیں۔ اتنی تیز رفتار اختراع و ایجاد کسی اور میدان میں تقریباً ناممکن ہے۔ دشنام طرازی کے لئے نہ مخصوص تعلیمی قابلیت کی قید و بند ہے نہ سماجی حسب مراتب کی بقدر استعداد، ماحول اور فطری تقاضے کے یہ خود بخود خارج ہو جاتی ہے۔

جس طرح مختلف ملبوسات کے رنگ، ڈیزائن، ساخت مثلاً مردانہ، زنانہ، بچکانہ، موٹے اور پتلے ہوتے ہیں عین اسی طرح دشنام کی اقسام بھی زنانہ مردانہ اور بچکانہ ہوتی ہیں۔ بچکانہ دشنام سے مراد دائرہ ادب میں رہ کر بدالقابات سے تخاطب ہے۔ اسی طرح موٹی اور پتلی گالیاں بھی موقع محل اور غصے کی شدت کے اعتبار سے دی جاتی ہیں۔ فی زمانہ

زنانوں میں مردانہ لباس زیب تن کرنے کا جو رجحان عام ہوتا جارہا ہے ٹھیک اسی طرح خواتین بھی مردانہ دشنام طرازیاں یکساں آسانی سے کرتی نظر آتی ہیں خوشنما لباس پہننے سے عزت وتکریم میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح بدنما گالیاں ۔اب کس کو کون سمجھائے ۔۔۔۔اور بدنما گالیاں پہننے (سننے) سے یا پہنانے (دینے) سے ذلت میں ۔ایک زمانے میں گالیاں صرف اپنا رعب داب قائم رکھنے، کسی کی شان میں طعن وتشنیع یا لعنت وملامت کا ذریعہ تھیں مگراب خواص وعوام کی گفتگو کا خاص حصہ ہے جو جدید فیشن کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے ۔اب انداز تخاطب تعریف وتحمید اور مزاحیہ گالیوں اور تحقیر آمیز فقروں کا دور دورہ ہے جسے کہنے میں نہ فاعل کو عار محسوس ہوتا ہے نہ مفعول کے لئے گراں بار طبیعت گویا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

بعض تعلقات کی نوعیت عجیب وغریب ہوتی ہیں جہاں اظہار محبت وعقیدت کی سبیل گالیوں کا تبادلہ ہوتا ہے ۔بے تکلفی کا معیار مغلظات اور دشنام گوئی سے شروع ہوتا ہے ۔اگر کوئی دشنام طرازی سے پرہیز کرے تو اس پر تصنع کا شائبہ یا سازش کی بو کا گمان ہوتا ہے ۔

واں گیا بھی میں، تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں ، صرف درباں ہو گئیں

دشنام طرازی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی عاشق ومعشوق کی چھیڑ چھاڑ کی ۔معشوق کے ایک بوسے کی خاطر عاشق ذلت کی تمام منازل سے بخوشی گذرنے پر آمادہ نظر آتا ہے اور دشنام معشوق کی لذت سے روشناس ہوتا ہے تو سدا اس کا متقاضی ومتمنی ہوتا ہے

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
منہ میں زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

مگر جب بوسہ معشوق کے حصول میں ناکام ہو جاتا ہے نصیب العین خاک میں مل جاتا ہے تو وہ لذت دشنام معشوق پر ہی قانع وشاکر نظر آتا ہے

بوسہ کیسا ؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

معشوق کی دشنام طرازی کی لذتیں عاشق کو کن تصوراتی مسرتوں سے باور کراتی ہیں کہ عاشق تمام ذلت و رسوائی سے بیگانہ بوسے کی لذت کی چاہ میں دشنام معشوق سے لذت اور جس استہزا کے کیف سے سرشار ہوتا ہے بقول مومن

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

خیر یہ تو ذکر تھا ہوش سے بیگانہ زلف معشوق کے پرستار عشاق کا جن کو خیال یار کے سوا کوئی بات نہیں سوجھتی ہے۔ مگر ہر دشنام کا ردعمل دشنام ہی ہو ایسے کوئی کلیہ وضع نہیں ہوا ہے اکثر و بیشتر با غیرت حضرات دشنام کے جواب میں زور آزمائی پر اتر آتے ہیں جس سے فاعل کو دوہری سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ پہلے تو تشدد کے نتیجے میں درد کی افتاد اور ڈاکٹر کے معالجے کے لئے خطیر رقوم کا اصراف بھی سہنا پڑتا ہے لہٰذا اخلاقی حدود میں رہنے صبر و ضبط کرنے سے صبر کے میٹھے پھل میسر آنے کے امکانات ہمہ وقت روشن ہوتے ہیں۔ نہ درد کی افتاد نہ مالی خسارے کا خوف نہ ہی ذلت وخواری تاکہ احسن تقویم کا پتلا کہیں ضرب دشنام سے پاش پاش نہ ہو جائے۔

عموماً دشنام طراز طیش میں اور غیظ و غضب کے زیر اثر اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لیتا ہے مگر گرد و پیش کے باہوش و حواس عوام اس کے تعلق سے کیا خیال کرتے ہیں وہ ان معاشرتی حلقوں سے بے خبر تسکین دل کے بہانے ڈھونڈتا ہے عوام کے ذہن میں اس کا تصور پستی کی طرف مائل نظر آتا ہے لہٰذا بڑا تعارف بھی حسن ظن ضائع ہونے کا خطرہ در پیش رہتا ہے۔ اخلاقی پیمائش نقطۂ صفر کو مس کرتی ہے۔ سارا بھرم پانی پانی ہو جاتا ہے۔ ان تمام واقعات سے یہ بات عیاں ہے کہ آپ اگر احسن مکارم اخلاق و آداب کا مظاہرہ کرتے ہیں تو جواباً آپ کو تکریم و احترام اور حسن ظن کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

اگر آپ کو مذکورہ بالا سطور سے اتفاق ہے اور اپنے آپ میں اخلاقی جرأت کے مردانہ عناصر پاتے ہیں تو دو قدم کی سعی کیجئے۔ اپنے عزت نفس کے تحفظ کے لئے عادت قبیحہ سے نجات حاصل کیجئے۔ اگر ٹوٹی پھوٹی تجویز پسند آجائے تو دعا دیں ورنہ میں اپنا بین بجانا بند کرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہیں مجھ پر ہی دشنام طرازی نہ ہونے لگے۔

کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

دشنام طراز بڑی آسانی سے مفعول کے شجرہ نسب میں دست درازی کرتا ہے۔ شجرہ نسب سے چھیڑ چھاڑ کے ساتھ اس کے افراد خانہ کو باآسانی تمام جانوروں، غیروں اور نہ جانے کن کن حوالوں سے منسوب کر دیتا ہے جس کا شعوری ادراک نہ فاعل کو ہوتا ہے نہ وہ دشنام کے مفہوم کی گہرائی و گیرائی اور اس سے روبہ عمل ہونے والے سنگین تصورات سے باخبر ہوتا ہے نہ فاعل کو ان تفصیلات سے قطعی علاقہ ہوتا ہے۔ فاعل خود تو اپنی نگاہ میں معصوم و پاکباز ہوتا ہے مگر مفعول کے جملہ خاندان کو بد چلنی و آوارگی کے سپرد کر کے لمحہ بھر کا سکون قلب ڈھونڈ لیتا ہے جو شرعاً کسی بہتان سے کم نہیں ہے۔ اگر فی بہتان کم از کم ۸۰ رکوڑے کی شرعی سزا تسلیم کریں تو اس لحاظ سے فاعل کے محاسبے کی تکمیل تک فاعل آنجہانی نہ ہو جائے۔ باوجود اس کے وہ حقوق العباد کی گرفت سے آزاد نہ ہوگا۔ لہٰذا دشنام طرازی جیسے قبیح و غیر شعوری عمل سے پرہیز کی شعوری کوشش ہم سب کو فوراً اسے پیشتر کر لینی چاہئے اور سابقہ گناہوں سے توبہ استغفار بھی۔

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

مالِ مفت دلِ بے رحم

انسان کا کفایت شعار یا قناعت پسند ہونا گو کوئی معیوب بات نہیں ہے بلکہ ان کا شمار تو محاسن میں ہوتا ہے۔ مگر ان محاسن کے پس پردہ دوستوں سے فضول خرچیاں اور بسیاری خوریاں کروانا شرافت کی دلیل تو ہر گز نہیں ہو سکتی۔ ایسے بے شمار کردار ہمارے اطراف "ایک ڈھونڈو ایک ہزار ملتے ہیں" کے مصداق محو خرام نظر آتے ہیں۔ جنھیں کچھ تو تجاہل عارفانہ اور کچھ فراخ دلی کے جذبے کے تحت برداشت کیا جاتا ہے جو اصلاً مفت خور اور اصولاً طفیلی ہوتے ہیں یوں بھی ان طفیلیوں کی اولین پسند ایسے اشخاص ہوتے ہیں جنھیں عوام میں اپنی برتری، فوقیت کبریائی کی دھاک بٹھانے کا شوق انہیں آتش زیر پا رکھتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مفت خور امراء، صاحب مال و زر، نو دولتیوں کے علاوہ سیاستدانوں کے ہاں مقبول و معروف ہوتے ہیں جو سماجی رواداری کی عمدہ مثال ہے۔ انسان بالآخر ایک سماجی جانور ہے جو ہمہ وقت طفیلیوں کی زد میں رہتا ہے اور فریق ثانی کا مسلک ہے "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" بلفظ دیگر امراء کو امیر بنانے یا کہلوانے میں یہی افراد سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ جن کی مصاحبت میں صاحب کی امارت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ایسے باوصف حضرات کے اہل خانہ کو بھی ان کی طرف سے یہ قلق نہیں ہوتا کہ بیٹا نکھٹو ہے۔ البتہ یہ اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ بیٹا لائق فائق، نیک خو، احسن عادات و اطوار کے ساتھ ساتھ نیک خصائل شرفاء کی صحبت کا عادی ہے اور کچھ خوش گمانیاں غالب ہوتی ہیں جو درحقیقت غلط فہمیوں کی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہیں کہ بیٹا بلا کا قناعت پسند واقع ہوا ہے نہ فضول خرچیوں کا عادی ہے نہ بسیار خوری کا اور کفایت شعاری تو گھٹی میں پڑی ہوئی ہے مگر ان بے چاروں کا کیا قصور؟ انہیں کیا پتہ کہ دن بھر میں صاحب زادے کتنے ہی مرغے بغیر بسم اللہ کے حلال کرتے ہیں؟ گویا ہم قتل بھی کرتے ہیں، تو چرچا نہیں ہوتا۔

مفت خوروں کے کچھ مرغوب مشاغل ہوتے ہیں مفت کی کرسیوں پر، مفت کی اخبار و رسائل بینی، مفت کی چائے سے لذت آمیز چسکیاں، مفت کی بیڑی یا سگریٹ کے کش لگانا پھر ان سے دھوئیں کے دائرے نما مرغولے خارج کرنا، مفت کے پان سے ہونٹ سرخ، مفت کے موضوعات پر سیر حاصل بلکہ لاحاصل مباحثے، مفت کے گیت سننا (سمعی عیاشی)، مفت کی فلمیں دیکھنا (سمعی و بصری عیاشی)، مفت کی مہمان نوازیوں اور خاطر داریوں کا لطف اٹھانا، مفت کی دعوتوں اور ضیافتوں میں شرکت، مفت کی سواریوں پر سیر و تفریح کے مزے چکھنا حتیٰ کے مفت کی گھڑیوں میں وقت دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان خواص کی وجہ سے ہی مفت خور حضرات سیاست دانوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں بالخصوص انتخابی موسم تو ان کے ہاں عید سعید جیسی خوشیاں لے آتا ہے۔

مفت خوروں کا شعار بقول شباب للت ملاحظہ فرمائیں ۔

کام تنہا جی حضوری تو نہیں
کھیر حلوہ ہی ضروری تو نہیں
یہ اتر جاتے ہیں روغن جوش میں
جلوہ گر ہیں بزم فانوس میں
محفلیں سنسان ہیں ان کے بغیر
دعوتیں ویران ہیں ان کے بغیر

مفت کی گردان خاصی طویل ہو جاتی ہے جو قارئین کے باذوق ذہن پر گراں بار گزرتی ہے لہٰذا راقم التحریر کے خیال میں ایسے مفت خور مفاد پرست افراد کو ایک عدد استعاراتی عرفیت عطا کر دینا چاہئے "سوامی مفتانند جی" اب اس کی وجہ تسمیہ کا خلاصہ بھی ہو جائے تو غالباً قارئین کو لطف آجائے۔ سوامی اس لئے کہ یوں بھی انہیں دنیا جسے دار العمل یا دار الاسباب ہونے کا شرف حاصل ہے اس سے برگشتہ و بے نیاز ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کسی پنڈت، مہنت یا تارک الدنیا سوامی کا نام نہیں ہے۔ مفت خوری کی مفید عادات انہیں مفت میں آنند (جملہ مسرتیں) فراہم کرتی ہے لہٰذا ان حضرات کے لئے "مفتانند" سے بہتر عرفیت بھلا اور کیا ہو سکتی ہے اور باوجود ان تمام اوصاف خمیدہ کے ہم انہیں عمداً یا سہواً گوارا کرتے ہیں لہٰذا "جی" کا لاحقہ لگا کر ہم ان کی شخصیت کا بھرم رکھ لیتے ہیں خواہ طنزیہ امور پر ہی کیوں نہ ہو۔

مفت خوروں میں خود بخود ایسے اوصاف در آتے ہیں جسے جی حضوری، ہاں میں ہاں ملانا، ضرورت سے زیادہ بیجا مسکرانا، خاموشی سے سر ہلا کر تائید کرنا خواہ ضروری ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا ان میں صاحب مال و زر کے علاوہ سیاست دانوں کے مصاحب (چمچے) بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے جن سے وہ اپنی جملہ ضروریات، شوق، وقت گذاری اور ممکنہ اخراجات کے حصول کے لئے تعریف کے بھوکے امراء، نو دولتیے، سیاست داں، فضول خرچ اور بسیار خور قسم کے اسامیوں کے گرد ہمہ وقت جمع رہتے ہیں اور ان سے وقتاً فوقتاً اپنا مطلوبہ نشاستہ کشید کر کے دنیا و مافیہا سے بے فکرے اور آزاد رہتے ہیں وہ بھی بالکل مفت یعنی ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ آوے چوکھا۔

مفت خور حضرات محفل یاراں میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اقسام کی ہوٹلوں میں لذت کام و دہن کے بعد جب رقم کی ادائیگی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے وہ یا تو "آپ رہنے دیجئے" کہہ کر تصنع آمیز مسکراہٹ بکھیریں گے مگر شعوری کوشش ناتمام صاف عیاں ہو جاتی ہیں یا وہ اکثر منتظر فردا نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بصد کوشش بسیار ہاتھ جیبوں کے بالائی حصے کو ٹٹول کر بے نیل و مرام لوٹ آتے ہیں اور جیب کی اتاہ گہرائیوں میں اترنے سے اس طرح گریزاں ہوتے ہیں گویا جان جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ تاوقت یہ کہ رقم کی ادائیگی کا مرحلہ کسی اور کے ذریعے طے پا جاتا ہے جس سے موصوف کی عزت بھی الحفیظ والاماں محفوظ رہ جاتی ہے سچ ہے کہ خدا کی قدرت ہے۔ خدا شکر خوروں کو شکر ہی کھلاتا ہے مگر پھر بھی مفت خور

حضرات شکر ادا نہیں کرتے۔

غیرت مند شخص مر کے بھی دوستوں کے شانوں کا بار نہیں بنتا اس کے برعکس مفت خور جیتے جی دوستوں کے دوشِ ناتواں پر بوجھ بنا پھرتا ہے۔ اپنی عادات و معمولات پر ڈٹے رہنے کے لئے وہ نت نئے دوستوں کی تلاش میں کوشاں ہوتا ہے۔ جن پر وہ کچھ آزمودہ حربے اور ہنر کی طبع آزمائی بھی کرتا ہے جس کا اولین جزو ہے خوشامد، بیجا تعریف اور دلآویز گفتگو جو دل میں گھر کر لینے کی آسان سبیل ہے۔ چوں کہ ''سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں'' بعض اوقات نئے دوستوں کی تلاش یوں ہوتی ہے جیسے شکاری اپنے بسمل کی جستجو میں برسرِ پیکار ہوتے ہیں جب تک نئے شکار کا لطف و کرم، عنایات ان پر ہوتی ہے تو مفت خور حضرات کی قوت کشید بھی خاطر خواہ حوصلہ پاتی ہے۔ جوں ہی ان پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ تلوں میں تیل نہیں بچا تو وہ بجائے غم گساری کہ فوراً اگلی ڈال کا رخ کر لیتے ہیں اس موقع شناسی سے ان کی طوطا چشمی عیاں ہو جاتی ہے اس طرح ان کے شکار کے زد میں متمول، عیاش طبع اور فراخ دل حضرات آتے ہی رہتے ہیں۔

مفت خور حضرات خاصے بے غیرت ہوتے ہیں جنھیں نہ بکی جھلاہٹ غصہ اور انا کا مسئلہ جیسے امراض لاحق ہوتے ہیں نا ہی بلڈ پریشر ہارٹ اٹیک اور ہیجان وغیرہ۔ اگر کوئی دل جلا، من چلا شاکی ان پر طنز کے تیر اور الفاظ کے نشتر چلانے کی کوشش بھی کرے تو یہ شان بے نیازی سے خوبصورت مسکراہٹ سے دھول چٹانے اور اپنے غصے کو بآسانی تحلیل کرنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ زبان خاموش سے اشاروں میں اس شرارت کا کرارہ جواب دیتے ہیں کہ حملہ آور کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ مذکورہ مفت خور حضرات جن کا وطیرہ ہے ''مال مفت، دل بے رحم'' اپنی پوری توانائی واستعداد بجائے فضول وقت گذاری کے کسی پیشے صنعت یا کاروبار میں صرف کرتے ہیں تو انہیں یہ احساس ہوتا ''ہم بھی آدمی تھے کام کے'' مگر ان مفت خوروں سے زیادہ قصور وار وہ افراد ہیں جو انہیں اپنے گرد جھوٹی شان اور خوشامد کی خاطر بٹھائے رکھتے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مانع ثابت ہوتے ہیں اور ان کے ہاں جو حقیقی محنت کش اور قابل افراد کی خدمت سے صرف نظر کرتے ہیں چوں کہ مفت خوروں کے چنگل میں پھنسا ہوا شخص دنیا سے تو اٹھ سکتا ہے البتہ ترقی کے لئے نہیں اٹھ سکتا۔

خون کی تجارت

قدرت نے، خواہ انسان ہوں یا حیوان جو ہر کسی رنگ ونسل، ذات وقبیل سے وابستہ ہوں ان کا خون سرخ رنگ کا بنایا ہے۔گو خون کی گوناگوں خصوصیات لا ثانی ہیں۔جہاں دورانِ خون ایک زندگی کی علامت ہے وہیں جسم میں حرارت پیدا کرتا ہے۔جہاں خون جمود کی شکل اختیار کرلے یہ موت کا پیغام ہوتا ہے اور جسم سرد و بے جان ہو رہتا ہے۔خون کے رشتوں کی محبت اور عداوت دونوں ہی بے مثال ہوتی ہیں۔پھر بھی خون خون کو پہچانتا ہے۔خون اچھا بھی ہوتا ہے اور گندہ بھی۔اگر خون سفید ہو جائے تو ساری محبت، اخوت، مروت، رشتے، ناتے اور انسانیت کے جذباتی جال سے آزاد ہو جاتا ہے۔خون گرم ہو جائے تو عداوت، دشمنی، تشدد اور انتقام جیسے جارحانہ جذبات کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔خون جب جوش مارتا ہے تو ساری نفرتیں، کدورتیں اور عصبتیں بالائے طاق رکھ کر رشتے ناتے جوڑ دیتا ہے۔خون جب اپنا رنگ دکھادے تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، مگر اپنی اوقات ضرور ظاہر کر دیتا ہے۔اکثر امراء و روساء جنہیں سات خون معاف ہوتا ہے لہٰذا وہ غریبوں کا خون پانی کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے غریبوں کے خون کی ہولی کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے۔غریبوں کے ارمانوں کا خون کر دینا یا انہیں خون کے آنسو رلانا ان خون آشام افراد کا شوقیہ مشغلہ ہے۔خون چوسنا بھی ایک ایسا مقبول اور آفاقی مرحلہ ہے جسکے شائقین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

انسانی خون چوسنا چشم تصور سے ہی گھناونا اور کراہیت آمیز عمل ہے۔جو نہایت ظالمانہ، وحشیانہ اور قبیح بھی ہے۔ہر چند کہ انسانی خون چوسنا مچھروں، کھٹملوں اور جونک جیسے دیگر جانداروں کا غذائی وظیفہ اور جبلتی مجبوری ہے، ان سے قطع نظر اس کے صارفین اور طلبگاروں میں سود خور مہاجن، ساہوکار، بنیئے، زمیندار، امراء و روسا اور سیاستداں بھی شامل ہیں۔مذکورہ افراد انسانی خون چوس کر موٹے (خوشحال) اسامی بن جاتے ہیں۔عصر حاضر میں خون چوسنے والوں کی صفوں میں شریفانہ وشاطرانہ اضافے بھی ہو رہے ہیں۔ماضی میں طبیب و ڈاکٹرس کا پیشہ عظیم خدمت تصور کیا جاتا تھا، مگر دورِ حاضر میں ڈاکٹرس اور ان کے معاون پیشہ حضرات نے بھی بعنوانِ خدمت انسانی خون کا مزہ چکھ لیا ہے۔جو قوم کی خدمت کا دم تو بھرتے ہیں مگر دراصل قوم کے دم سے جیب بھرتے ہیں۔غالباً انفرادی طور پر مذکورہ عمل اسقدر کارگر اور منافع بخش نہیں رہا، لہٰذا مہذب و منظم طور پر اسے اجتماعی تجارتی شکل دیدی گئی تاکہ مزید لذت آمیز اور مفید ثابت ہو۔

کمرشیل بینک ہوں یا بلڈ بینک، ان کی اساس ہی خون چوسنے کے عمل پر ہوتی ہے۔کمرشیل بینک بنام خدمت اپنے صارفین کی مشکلات کے حل کے لئے قرض مہیا کرتے ہیں۔جس سے صارفین مکان کی تعمیر، گھریلو وتجارتی

اشیاء، کاروں اور سواریوں جیسے مصرف میں خرچ کر دیتے ہیں۔ بینک آسان قسطوں کے ذریعے خون چوسنے کا مستقل وظیفہ صارفین سے حاصل کرتے ہیں۔ بلڈ بینکوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جہاں خون کے عوض خون تو دیا جاتا ہے مگر قیمتاً جہاں آپ کے جسم سے نکلا ہوا خون قطعی مفت بلکہ بطور عطیہ وصول کیا جاتا ہے اور آپکا مطلوبہ خون آپ کو مہنگے زخوں پر بطور خدمت فراہم کیا جاتا ہے۔ یعنی رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔ عموماً مصروف زمانہ صارفین کو نہ تو معاشی پہلو پیش نظر ہوتا ہے نہ وہ رقم کے اعداد و شمار سے غرض رکھتے ہیں وہ کمال مرعوبیت سے بل ادا کر کے مریض کی جان بچانے کی فکر میں کوشاں رہتے ہیں۔

بیمہ کمپنیوں کا لائحہ عمل بھی مذکورہ بالا اداروں کے نقش قدم پر رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ جان کے تحفظ کے پس پردہ خون چوستی ہیں۔ بلکہ اپنے صارفین کے عزیز و اقارب کو اُن کا خون کر دینے کا سامان بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح قسطوں پر اپنی اشیاء فروخت کرنے والے شوروم اور سوپر مارکیٹ جو فرنیچر، آسائش و آرائش حیات کے لوزمات فراہم کرتے ہیں انہیں بھی صارفین کا خون چوسنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں گلہ اور اشیائے ضروریہ کی کالا بازاری کرنیوالے کاروباری بھی خون چوسنے میں سبقت لے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں مختلف النوع خون کے مزے بیک وقت میسر ہوتے ہیں۔ یہاں مذکر مونث چھوٹے بڑے تعلیمیافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، سرکاری اعانت کے ساتھ ساتھ طلباء کے سرپرست حضرات کا خون ہر سمت سے چوسے جاتے ہیں۔ جس سے بھرپور مزہ کشید کرنے کا نظم ہوتا ہے۔ تعلیم کی نشر و اشاعت ایک مقدس و پاکیزہ خدمت ہے جہاں علم و دانش کے پس پردہ ہر قسم کا خون چوسا جاتا ہے۔ سماجی خدمت قوم سے ہمدردی اور فلاح و بہبود کے طفیل عزت و اکرام کے علاوہ سیاسی قیادت کے سنہرے مواقع بھی حاصل ہوتے ہیں۔

خون بھی قدرت نے اصیل شئے بنائی ہے۔ جو پانی کی ملاوٹ سے محفوظ رہتا ہے۔ لہٰذا دودھ کی طرح پانی ملا کر خون کا حجم نہیں بڑھایا جا سکتا ہے۔ نہ ہی اسکی مصنوعی پیداوار ممکن ہے ورنہ دودھ، گھی، پنیر، چھانچھ، مکھن اور ڈالڈا کی طرح خون کی بھی صنعتیں قائم ہو چکی ہوتیں۔ یہی وجہ نہیں ہے کہ انسانی خون کی مانگ بہت ہے بلکہ اسکی چند اور وجوہات ملاحظہ فرمائیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ موٹے (خوشحال) طبقے کا خون ہونا ہو تلخ، بدمزہ اور امراض و جراثیم سے لبریز ہوتا ہے یا تو غالباً ہر لذت سے عاری ہوتا ہوگا۔ چونکہ اس قسم کا خون چوسنا بے سود تصور کیا جاتا ہے۔ جس سے تضیع اوقات کا خطرہ بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس خون جلانے والے غریبوں اور محنت کشوں کا خون سود اور سواد کے اعتبار سے بڑا مزیدار اور بڑی مانگ کا حامل ہے۔ گاڑھی کمائی کا گاڑھا خون ہر طبقے کی اولین پسند ہے۔ کیوں کہ گاڑھی کمائی کرنیوالے کا خون رزقِ حلال کے باعث محفوظ اور شدید محنت کیوجہ سے جملہ امراض سے پاک (Sterlized) ہو جاتا ہے۔ موٹے حضرات موٹی موٹی بیماریوں اور پریشانیوں کے سبب مزید موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ جن کے قریب مچھر، کھٹمل اور جونک تو کجا مکھیاں بھی پھٹکنا گوارا نہیں کرتیں۔ عموماً موٹے حضرات خون چوسنے کے کریہہ عمل کو جائز اور روا

قرار دینے کے بلئے خدمت کا مقدس جامہ زیب تن کر لیتے ہیں۔ مگر پس پردہ وہی گورکھ دھندہ شباب پر چل رہا ہوتا ہے۔

سیاست دانوں کا وصف خاص ہے کہ وہ اپنے خون کو بہر حال خون سمجھتے ہیں مگر عوام کے خون کو پانی۔ لہٰذا جب تک بغیر خون بہائے دکان سیاست چلتی رہتی ہے یہ بھی خاموشی سے فائدہ اٹھانے پر اکتفا کرتے ہیں مگر جونہی بساط سیاست پر مہرے اُلٹے پڑنے لگتے ہیں ان کا خون جوش مارتا ہے آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ تب یہ معصوم عوام پر شبخون مار کر انہیں فسادات اور بم دھماکوں کوزد میں خون آلود کر دینے سے بھی باز نہیں رہتے۔

عہد قدیم میں شاہان و سلاطین اپنے جوانمرد سپاہیوں کو خون بہانے کے عوض تمغے انعامات و جاگیر سے نوازتے تھے۔ بے گناہوں کے خون کا کفارہ خون بہا کی شکل میں دیئے جانے کا رواج تھا۔ دور حاضر کی اقدار جدیدہ میں خون چوس کر تمغوں کے حصول کی دوڑ جاری ہے۔ اکثر سیاسی جلسوں میں ہجوم سے خطاب کے دوران اہل سیاست سستا خون، مہنگا پانی کا نعرہ دے کر غیر محسوس طور پر اس بات کا اقرار کر لیتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر راقم التحریر کا خون بھی خشک ہوا جاتا ہے۔ جنگل کے وحشی درندے خون آشام ہوتے ہیں یا مذکورہ بالا سفید پوش انسان اور انسانیت کے علمبردار ہیں؟ اس کا فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہے۔

مخبر

مخبر خواہ معاشرے کا اخلاقی مجرم ہی سہی، مگر محکمہ پولس کا محرم ہوتا ہے۔ وہ جہاں سارے معاشرے سے دغا کرتا ہے، وہیں وہ پولس کا منظورِ نظر اور دستِ راست بننے کی دعا کرتا ہے۔ اس طمع میں کہ پولس سے اپنی مطلب براری کی تکمیل ہو۔ مخبر ہونا کوئی منہ کا کھیل نہیں ہے بلکہ قدرے جان جوکھم میں ڈالنے کا کھیل ہے۔ سارے معاشرے سے پردہ ہی سہی تنہا برسرِ پیکار ہونا کوئی معمولی شخص کا کام نہیں ہے۔ عوام الناس کی خفیہ خبروں کو انتہائی رازدارانہ طور پر پولس کے گوش گذار کرانا بھی جرأت آمیز کام ہے۔ پھر ان تمام مشاغل کا ردِ عمل مثبت ہو یا منفی اسکا بھی تیقن نہیں ہوتا۔ اگرچہ کوئی مبتدی مخبر ایسا کر بھی لے تو سراسر حماقت ہے کہ اعتبار وہ بھی پولس پر؟ من و عن ایسا ہے جیسے "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"۔

مخبروں کے کچھ بنیادی صفات اور پیدائشی خواص ہوتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر پولس انہیں منہ لگاتی ہے یا ناک کا بال بناتی ہے۔ ان میں ابتداء سے غیبت، چغلی، خفیہ پیغام رسانی اور تجسس کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ ان قبیح خصائل کی زیادتی رفتہ رفتہ انہیں نہایت مذموم لتوں کا عادی بنادیتی ہے۔ مثلاً حسد، کینہ، بغض، عناد، انتقام، اور بلیک میلنگ وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان میں ہمہ وقت کتوں کی طرح کان کھڑے رکھنے، سونگھنے، سننے، اور محسوس کرنے اور دم ہلانے کی عادات بھی بقدرِ ضرورت در آتی ہے۔ اور ان میں یہ قدر مشترک ہوتی ہے کہ کتا اپنے ہی ہم جنس پر بھونکتا ہے اور ہم جنس سے ہی باہم دست و گریباں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سراغ رسانی میں کتے بڑے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ الہٰذا پولس ان کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ پیدا کرلیتی ہے جو ان کی پیشہ ورانہ ضرورت اور مجبوری کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ بڑے وقتوں میں پولس انہیں نرم چارہ بنانے سے بھی باز نہیں رہتی۔

مخبر حضرات بڑے نبض شناس ہوتے ہیں اور 'پتہ کھڑکا، بندہ سرکا' کے مصداق سماج میں خیر خواہی کے نام پر سماج کی بیخ کنی کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام مساعی کا حاصل عمل محض پولس کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ مخبر اپنے فعل میں اسقدر طاق اور طبیعت کے ایسے گھاگ ہوتے ہیں کہ ضمیر کی آواز کو بھی اس خوش فہمی میں درگور کردیتے ہیں کہ ان کے تمام اقدام پولس کے ہاتھ مضبوط کرنے، وطن عزیز کی خدمت کرنے اور امن و سلامتی کے قیام میں معاون و مددگار ہونے کی خاطر ہیں۔ مخبر بعض اوقات پولس کی ایماء پر کسی معصوم کے مستقبل سے بھی کھیلنے سے باز نہیں آتے۔ جس سے ان کی سفاکی اور بربریت واضح ہوجاتی ہے۔

محکمۂ پولس کے خفیہ شعبے کی جملہ کارکردگیاں انہی مخبروں کی فراہم کردہ سچی، جھوٹی، کچی، پکی، خبروں منحصر ہوتی

ہے۔ بلفظ دیگر مخبر حضرات پولس کے خفیہ شعبے میں سراغ رسانی کی بیساکھی کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ محکمہَ پولس کا عذر لنگ ہے کہ اس نے ہر قسم کی زور آزمائی کی، ہر قسم کے رسائل بروئے کار لائے جدید آلات سے لیس سراغرساں معاشرے میں پھیلا دیئے، جاسوسی کے نت نئے تجربات (انگریزی فلموں کی نہج پر) کر کے دیکھ لئے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ لہٰذا پولس نے معاشرے میں موجود نفرت انگیز جذبات جیسے حسد، دشمنی، انتقام اور طمع کے علاوہ تشہیر کے بھوکے افراد کو بروئے کار لا کر مخصوص کالی بھیڑوں کا انتخاب ہی شارٹ کٹ سمجھا۔

محکمہَ پولس کا سابقہ تجربہ بے ثمر رہا کیوں کہ کرسیوں پر نیم دراز فربہ اندام افسران جو آسودہ اور خوشحال ہوتے ہیں، نہ تو سراغ رسانی جیسے اہم ترین فرائض کی انجام دہی کے اہل ہوتے ہیں نہ ہی انکی موٹی عقلوں سے اس قسم کی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انہیں ضابطے کی کاروائی کے پس پردہ بعوض رشوت رسمی کاغذات سیاہ کرنے، ہر آج کا کام کل پر ٹالنے، حیلے بہانے تراشنے، تعزیرات ہند کے غیر معروف حوالے دینے کے علاوہ تنخواہ میں اضافے، بونس، الاونسز اور پے کمیشنوں کی لا یعنی مباحثوں نے جکڑ رکھا ہے۔ بمشکل جو فاضل اوقات بچ رہتے ہیں وہ یا تو شکم سیری یا پھر تاش کے پتوں کی بازی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سراغ رسانی کے انتہائی ذمہ دارانہ کام کا بار گراں معاشرے کے میر جعفر اور میر صادقوں کے شانوں پر آجاتا ہے۔ جن کے لیے شاعر مشرق کا فرمان ہے۔

میر از بنگال ، صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

ان مخبروں کو عرف عام میں خبری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو اکثر بلا معاوضہ یا معمولی سے معاوضے پر پولس کی رہنمائی اور عوام کی راہزنی کرتے ہیں۔ پولس کی حمایت انہیں خاصہ حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا وہ معاشرے کے بھولے بھالے عوام کی ہر ظاہر و پوشیدہ حرکات کی مخبری اس خوش فہمی کے تحت کرتے ہیں کہ عوام ان کی خفیہ حرکات سے ناواقف ہوں۔ چنانچہ مردہ خوری ان کا محبوب مشغلہ بن جاتی ہے۔ درحقیقت یہی خوش گمانی غلط فہمی کا شاخسانہ بن جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے بلی دودھ پیتے وقت اپنی آنکھیں موند لیتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چونکہ پولس والے نہ تو کسی کے سگے ہوتے ہیں اور نہ قانون و قواعد سے آزاد بلکہ وہ اپنے افسران بالا کے احکامات کے پابند اور تعزیرات ہند کے تابع، فرمانبردار اور جوابدہ ہوتے ہیں۔ بہر کیف محکمہَ پولس مخبروں کی کسی قدر پشت پناہی، حمایت اور ہمنوائی کرتا ہے کیوں کہ ہر مقدمے میں درکار جھوٹے اور فرضی یا ڈمی قسم کے گواہوں کی حیثیت سے یہی مخبر حضرات کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

بعض اوقات محکمہَ پولس کی شہ پر مخبر حضرات سے قانون سے متجاوز حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ اس خوش گمانی میں پھول کر کپا ہوئے جاتے ہیں کہ پولس ان کی وفاداریوں اور محرم شناسیوں کا صلہ دے کر ان کی پشت پناہی یا گلو خلاصی کریں گے۔ مگر عین وقت پر وہی پولس مخبروں کو ان کے کردہ و ناکردہ جرائم کی پاداش میں فرضی تعزیرات ہند کے

لوں سے حوالات کے حوالے کر کے سرکار سے تمغے اور انعامات حاصل کر لیتے ہیں اور شانوں پر ستاروں کا اضافہ بھی کر
ے ہیں ۔اس وقت مخبروں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بزرگوں نے بجا فرمایا ہے کہ نہ
ں کی دوستی اچھی نہ دشمنی ۔

تاریخ شاہد ہے کہ گھر جکا بھیدی لنکا ڈھائے ۔راون کی اس لنکا میں ہر وبھیشن (مخبر) باون گز کے ہیں اور
میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے ۔مخبروں کو خفیہ طور پر خفیہ پولس کی خطیر مدد کرنے پر
کاری داماد ہونے کا غرہ ہو جاتا ہے ۔انہیں یہ خام خیالی بھی ہو جاتی ہے کہ پولس ان کی خدمات کے عوض ان کے من
کام کریگی ۔ان کے اشاروں اور سفارشات کو ملحوظ رکھے گی تو یہ کم ظرف معاشرے کے سیدھے سادے افراد پر رعب
نے سے بھی باز نہیں آتے بہر حال پولس کی نظر میں مخبر محض ایک استعمال کی شۓ USE & THROW ہوتا ہے
خدا کی نظر میں راندۂ درگاہ ہوتا ہے ۔لہٰذا جن حضرات نے پولس کی ایما پر اس کام کی شروعات کی ہو وہ فیصلے پر نظر ثانی
یں اور جنہیں اس کی مستقل لت 'نشہ' ہے انہیں اللہ ہی بچائے ۔

سرپوشی

جسم کی پوشش بشری جبلت کے عین مطابق ہے۔ اعلیٰ ذوق کے اعتبار سے زیب و زینت اختیار کرنا
صرف سماجی اہمیت کا حامل ہے بلکہ معقول و معمول کا حصّہ بھی۔ عہد قدیم میں سرپوشی کو مرد حضرات کی شان و شوکت، وضع
داری یا ذوق و شوق کا جز و تھی۔ مگر فی زمانہ سرپوشی یا تو مجبوری ہو گئی ہے۔ یا پھر پیشہ ورانہ ضرورت۔ ہر بدلتے دور کے
تقاضوں نے سرپوشی میں نہ صرف جملہ اقسام کی اختراع و ایجاد کی گنجائش بہم پہنچائی ہے، بلکہ تنوع، رنگ، ہیت، ساخت،
حجم اور قیمت کے مختلف تجربات نے انہیں وہ معنویت، علامات اور عرفیت عطا کی ہے جو کسی اور قسم لباس کو میسر نہیں۔
دورِ ماضی میں اگر تاج، کلاہ و پپاخ کی مختلف اقسام نہ ہوتیں تو بادشاہ، شہزادے، وزراء، امراء، درباری، حکیم
خانساماں، اردلی۔ دربان کے علاوہ دیگر عہدیداروں میں امتیاز کیسے ہوتا؟ ظاہر ہے طرۂ امتیاز ہی سرپوشی کا مرہونِ
منت ہوتا ہے۔ اگر مختلف ساخت، رنگ اور ہیت کے دستار، عمامے اور سرپیچ (پگڑی) نہ ہوتے تو اولیاء اللہ، مرید و مرشد،
مجاور و قوال، سجادہ نشین اور متولیوں کا فرق کس طرح واضح ہوتا؟ اس طرح بہت سارے پیشہ ور حضرات، مذہب و ملت اور
ان کی ذیلی ذاتوں اور ضمنی جماعتوں کے علمبردار اور عبادت گذار مذہبی قائدین اپنی مخصوص شناخت کیلئے کونسا ذریعہ
اظہار تلاش کرتے۔ اگرچہ مختلف النوع پگڑیاں نہ ہوتیں سپہ سالار، عام سپاہی، ٹھاکروں، سکھوں اور شراب خانے کے
دربانوں کو کیونکر پہچانا جاتا؟ اور ان تمام سے فزوں تر اگر ٹوپیوں کی مختلف اقسام عالم وجود میں نہ آتی تو ہم نہ تو پیشہ وروں
اور نہ ہی مختلف مذاہب و مسلک افراد کو پہچان سکتے۔ اس طرح سرپوشی میں ہونے والی خوشگوار تبدیلیوں اور نت نئے
تجربات نے معاشرے میں شناخت کے مسائل کا بہترین حل تلاش کر لیا ہے۔

عہد قدیم کی بادشاہتیں لد گئیں۔ نہ تخت و تاج رہے نہ کلاہ و پپاخ نہ ہی شہزادوں کی کج کلاہیاں۔ چنانچہ
معاشرے کے اشراف نے سرپیچ (پگڑی) پر توجہ مرکوز کی۔ مگر پگڑی باندھنا کوئی منہ کا کھیل نہیں ہے۔ پگڑی کی
طوالت اور باندھنے کی ریاضت، خاصی فرصت طلب اور پگڑی کے پیچ و خم ہی کی طرح پیچیدہ مرحلہ ہے۔ بہر کیف پگڑی
باندھنا آج کے تیز روز مانے میں ناممکنات جیسا عمل ہو گیا ہے۔ اب وہ پگڑی باندھنے کا ذوقِ سلیم بھی نہیں رہا جو مردوں
کو پگڑی بدل بھائی بنانے کا محرک تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پگڑی باندھنا جس قدر دشوار گزار مرحلہ ہے، پگڑی اچھالنا اسی
قدر آسان۔ یہ بھی ایک خصوصی وجہ ہے کہ پگڑی ناپید ہوتی جارہی ہے۔ رفتہ رفتہ زمینداری اور جاگیرداری بھی لد گئی۔ آج
سابق جاگیرداروں کی یہ حالت ہے کہ سترگز پگڑی اور سر ننگا۔ ضرب المثل مشہور ہے ہارا جواری پگڑی رکھے۔ خواہ وہ بے
غیرتی یا مجبوری کے سبب ہی کیوں نہ ہو؟ دورِ حاضر کے ہارے ہوئے جواری اپنی پگڑی رکھنا تو درکنار دیگر حضرات

پگڑی اڑائے جانے سے بھی نہیں چوکتے۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر

سرپوشی جہاں اشراف کا شعار ہے وہیں غلاموں اور مساکین کی عزت رکھنے کا ذریعہ بھی۔ جو بے شک اکرام وتکریم کا باعث ہے۔ اس کی بدولت عوام پر رعب داب قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا عوام الناس اہل مراتب کو حسب مراتب ہر قسم کے سلام سے نوازتے ہیں۔ اور موصوف کی متوقع خاطر تواضع بھی کرتے ہیں۔ مگر گنجے سروں کی سرپوشی کی اہمیت نہ صرف کثیر المقاصد بلکہ ایک تیر سے کئی شکار سے بھی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اول تو دھوپ کی تپش سے حفاظت ہوتی ہے۔ تاکہ تپش میدان صاف دیکھ کر خون کا درجۂ حرارت نقطۂ اشتعال تک نہ پہنچادے کہ موصوف کا پارہ چڑھ جائے اور انہیں ضابطۂ اخلاق سے متجاوز نہ ہونا پڑے۔ اسطرح سرپوشی غصے کو قابو میں رکھنے کی تدبیر بھی ہے۔ اور تیسرا فائدہ یوں ہے اگر موصوف کی بیضوی چندیا جو دستار سے بے نیاز ہو تو ارباب ذوق کی ہتھیلیاں ان پر چپت رسید کرنے کی جسارت کرسکتی ہیں۔ اسطرح گنجے حضرات کے صاف وشفاف سر کے بلاوجہ عوام کے درمیان استہزاء بننے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ یوں گنجے سروں کی سرپوشی انہیں نہ صرف دھوپ کی تمازت سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ تسخر کی ہزیمت سے بچنے کیلئے مرجع ثابت ہوتی ہے۔

سرپوشی کیلئے سہل ترین، ارزاں ومقبول ذریعہ ٹوپی ہے۔ ٹوپی کی یوں تو بے پناہ افادیت ہے۔ مگر ملی نقطۂ نگاہ سے ٹوپی پہننے سے چہرہ نورانی، پاکیزہ اور معصوم نظر آتا ہے۔ خواہ وہ بغیر ٹوپی کے کچھ اور بھی نظر آتا ہو۔ ٹوپی پہننے سے احساسِ بندگی، عبادت وریاضت میں درکار خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے۔ مگر ہمارا سماج ٹوپیاں گھمانے والے یعنی اس کی ٹوپی اُس کے سر اور اُس کی اِس کے سر کرنے والے شاطروں اور ٹوپی پہنانے والے جعلسازوں سے بھرا پڑا ہے۔ جو دن دہاڑے مکروفریب کا بازار گرم رکھتے ہیں۔

ٹوپیوں کے ہمہ رنگ، ساخت، ہیئت اور استعمال نے مختلف ملک وقوم، مذہب وملت، مسالک ومنہاج اور ذات برادری کی شناخت کا وہ شاندار جواز پیدا کردیا ہے۔ جو کسی اور رشئے سے ممکن نہ تھا۔ آپ ٹوپیوں کو دیکھ کر باآسانی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فلاں ہندو، مسلم، پارسی، مہاجن، بوہرہ، گورکھا اور یہودی ہے۔ اس سے قطع نظر ٹوپیوں کی بدولت مختلف پیشہ ور حضرات بھی شناخت کی تخصیص پاتے ہیں۔ مثلاً جج، داروغہ، ڈاکیہ، چوکیدار، دربان اور کھلاڑی وغیرہ۔ خیر یہ تو عام تشخص وشناخت کا معاملہ ہے۔ مگر اُمتِ مسلمہ جسے ایک حساس جسم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی جملہ ذیلی وضمنی برادریوں، مکاتب فکر اور طبقات کو بھی متعلقہ ٹوپیوں کی تخصیص کے حوالے سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے۔ ٹوپی ایک وسیلہ بھی ہے کہ ہم اپنے مرحوم قائدین کو یاد رکھیں اور ان کا نام زندہ رکھیں۔ مثلاً جناح کیپ، جوہر کیپ اور گاندھی کیپ (جسے نہرو یا لال بہادر شاستری ٹوپی ہونا چاہیے تھا چونکہ گاندھی جی کی ایک بھی تصویر گاندھی جی کو اس ٹوپی کا حامل نہیں دکھاتی)

ٹوپی اشتہار بازی اور جماعت بندی دونوں کی یکساں ترجمانی کرتی ہے۔ ٹوپی کے سامنے نچلے سرے پر

چھوٹا سا سائبان نصب کر کے اسے کھلاڑیوں، راہگیروں اور مسافروں کو فیض پہنچانا بھی ایک اختراعی عمل ہے۔ مگر اس کی پیشانیوں پر مختلف کمپنیوں کی علامات چھپوا کر، مختلف رنگوں اور ساختوں کے حوالے سے اِسے ذریعۂ تشہیر بنانا ایک تجارتی حکمت ہے اور ایامِ انتخابات میں ان ٹوپیوں کی پیشانی پر انتخابی علامات اور نعروں کا اندراج کر کے انہیں مفت تقسیم کرنا بھی کسی سیاسی پارٹی کی سیاسی تدبیر ہے۔ جسے آج فیشن اور ضرورت کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ سرپوشی نہ انسانوں کو تقسیم کرتی ہے نہ ذریعۂ معاش کی بنیاد پر نہ طبقاتی درجہ بندی کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ٹوپیاں محض ہمارے اپنے خیالات، احساسات، جذبات اور ضروریات کی ترجمانی کرتی ہے۔

نور پبلیکیشنز
کی دیگر مطبوعات
اسلامی مدنی تعلیم
کھٹے میٹھے لطیفے
وہ کون تھی
سندباد جہازی
مومن کا ہتھیار